صابر ارشاد عثمانی

اداریہ

باقر نقوی

نئی بستی کے قلم کاروں کے سلسلہ میں باقر نقوی کو فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ ''پرواز'' کو فخر ہے کہ باقر نقوی کے بارے میں خاص نمبر نکالا جا رہا ہے۔ سید محمد باقر نقوی کا تعلق شہر الہ آباد کی مشہور شخصیت خان بہادر سید زاہد حسین کے خانوادے سے ہے۔ جس وقت ایام طفولیت ہاتھ پاؤں مارتے مارتے دم توڑ رہی تھی اور بلوغت اپنا علم بلند کر رہا تھا۔ اس ہی دوران ہندوستان کا بٹوارا ہوا اور انکے خاندان کو پاکستان کی طرف کوچ کرنا پڑا۔ ابھی کراچی میں قدم ہی نہیں جم پائے تھے کہ زندگی کے امتحانوں کی بوچھار شروع ہو گئی۔ کچھ ہی عرصہ کے بعد والد رحلت فرما گئے بڑے بھائی ہونے کے ناتے سے چار چھوٹے بھائیوں اور دو بہنوں کی پرورش کے ذمہ دار ہو گئے۔ اسکول کی تعلیم ختم کرنے کے بعد بجائے اس کے کہ کالج سے فارغ تحصیل ہوتے ایک مقامی لائف انشورنس کمپنی میں ملازمت اختیار کی اور Professional Qualification یعنی پیشہ ورانہ اہلیت کی سیڑھیوں کی طرف رخ کیا۔ اپنی محنت، لگن اور ذہانت کی کارکردگی سے ان سیڑیوں پر چڑھتے رہے چڑھتے رہے یہاں تک Chartered Insurer بننے کے لئے برطانیہ اور Insurance Management & Underwriting کی اعلیٰ تعلیم کے لئے زورچ سوئزرلینڈ گئے۔ ابھی کچھ سال قبل لیڈ آڈیٹر فور کوالیٹی مینجمینٹ کا امتحان دیا اور ISO9000 کے لیڈ آڈیٹر Lead Auditor بنے۔ اس طرح لائف انشورنس میں عمر کے چالیس سال بتا دیئے۔ جس میں برطانیہ میں ایک مقامی کمپنی میں اسٹنٹ ڈائرکٹر کے عہدے تک پہنچے۔ ۱۹۹۳ میں پاکستان میں EFU Life Assurance کی دوبارہ بنیاد پڑ رہی تھی اور قرعہ فال باقر نقوی کے نام نکلا۔ اس کمپنی کو نئے سرے سے شروع کرنے کی ذمہ داری سونپی گئی۔ جنرل منیجر کی حیثیت سے پاکستان گئے۔ نو سال بعد جب یہ کمپنی ترقی کے منازل طے کرنے لگی۔ اس سے دستبردار ہونے کی خواہش پیدا ہوئی تاکہ اہل خانہ کے ساتھ لندن میں زیادہ وقت گزاریں۔ اس نیت سے کمپنی کو چھوڑنا چاہتے تھے۔ لیکن کمپنی نے کہا اس شرط پر کہ ''تم جہاں بھی رہو بس ہمارے رہو''۔ یہ مثل صادق ہوگئی 'وہ کمبل کو چھوڑنا چاہ رہے تھے۔ مگر کمبل انکو نہیں چھوڑ رہا تھا'۔ بجائے فارغ کرنے کے انکو ایگزیکٹیو ڈائریکٹر Executive Director کے عہدے پر فائز کر دیا گیا۔ اب در حقیقت لیپ ٹوپ کمپیوٹر Laptop Computer ہی انکا آفس ہے جس کے ذریعے جہاں بھی ہوں دفتر سے رابطہ قائم رہتا ہے۔ ویسے سال میں چار پانچ بار پاکستان جانا رہتا ہے۔ اہل خانہ برطانیہ میں بس چکے ہیں سو خود کہتے ہیں۔

دور اک جزیرے پر کرلیا ہے گھر اپنا ۔۔۔ اب یہی وطن اپنا ' اب یہی نگر اپنا

اس سے قبل کہ انکی شاعری کی طرف رجوع ہوں انکی نثری کاوشوں پر روشنی ڈالتا چلوں جو ایک طرح سے اردو زبان میں اپنی نوعیت کی سنگ میل ہوگئی ہیں۔ ڈائنامائٹ کے مشہور زمانہ موجد الفریڈ نوبیل Alfred Nobel کا نام اور اسکے قائم کیئے ادارے سے دیئے جانے والے سالانہ انعامات ویسے تو جانے پہچانے ہیں مگر اردو پڑھنے والوں کے لئے اسکی بابت کم ہی معلومات مہیا تھیں۔ اس کتاب کو اب مکمل تفصیل کے ساتھ ترتیب کردی ہے جو زیر اشاعت ہے۔ ان تفصیلات کے ساتھ اردو زبان میں واحد کتاب ہوگی۔

اس کتاب کی بہت پزیرائی ہوئی۔ الفریڈ نوبیل کی مقبولیت کے بعد باقر نقوی کا دل بڑھا تو انہوں نے ایک دوسرا دلیرانہ کارنامہ انجام دیا۔ یہ کاوش ایک ایسے سائنسی موضوع پر کی جو شاید اکیسویں صدی کا سب سے دلچسپ اور اہم موضوع ہوگا جس کے ذریعہ اور سائنسی کرشمات اجاگر ہوں گے۔ باقر نقوی سائنسداں نہیں مگر انہوں نے کمال چابکدستی سے ایسے ادق اور خشک موضوع پر ایسی دلچسپ کتاب لکھی جس کے ذریعے اردو کا قاری Genetics, Human Genome Project and Cloning کے بارے میں کافی معلومات حاصل کر سکتا ہے۔ اس کتاب کا عنوان خلیے کی دنیا ہے جسے اس موضوع پر اردو زبان میں پہلی بار اس طرح عام فہم اور دلچسپ انداز میں پیش کیا کہ جو عام آدمی کو محیر العقول موضوع پر آسان زبان میں معلومات فراہم کرتی ہے۔ باقر نقوی جنکی تعلیم اور ملازمت کی بنیاد

ضرب اور تقسیم پر مبنی ہو اور جس کا زندگی بھر انشورنس سے واسطہ رہا ہو وہ ایسے موضوع پر اتنی اچھی کتاب تحریر کرے یہ کارنامے سے کم نہیں۔ باقر نقوی نے اس سلسلہ کو جاری رکھا ہے۔اس ہی سال جو کتابیں شائع ہوئی ہیں۔ برقیات۔ مع الیکٹرانکس کی مختصر تاریخ (برقیات و کمپیوٹر) اور جو زیر اشاعت ہے ''مصنوعی ذہانت''۔ یہ دونوں کتابیں اپنی نوعیت کی منفرد کتابیں ہوں گی اور جو اردو زبان میں تحقیقات کی بنیاد پر پہلا قدم ہوگا۔

اب آیئے انکی شعری تخلیقات کی طرف۔ پہلا شعری مجموعہ '' تازہ ہوا'' پہلا ایڈیشن ۱۹۸۸ء لندن، دوسرا ایڈیشن ۱۹۸۹ء دہلی۔ تیسرا ایڈیشن کراچی سے اور چھوتھا ایڈیشن دیوناگری میں الہ آباد سے شائع ہوا۔ اس مجموعے پر اردو مرکز لاس انجلس امریکہ سے بہترین شاعری کا ایوارڈ بھی ملا۔ دوسرا مجموعہ ''مٹھی بھر تارے'' ۱۹۹۱ء لندن، تیسرا مجموعہ '' موتی موتی رنگ'' ۱۹۹۷ء لاہور، اسکے علاوہ شاعری کے انتخاب کا ایک مجموعہ بنام پانچ شاعر اور پانچ ممالک دنیائے ادب کراچی سے شائع ہوا ہے ۲۰۰۰ء میں، یہی نہیں باقر نقوی کی غزلوں کا ایک اور انتخاب ہندی زبان میں الہ آباد سے ''گنگا، جمنا سارسوتی'' کے نام سے شائع ہوا ہے۔ جس کی ہندی کے قاریوں میں بہت پزیرائی ہوئی ہے۔ یہ انتخاب ہندی زبان کے کچھ شعراء کے اصرار پر کیا گیا ہے اس لئے کہ ان کے مطابق باقر نقوی کی شاعری میں ہندی زبان کا رچاؤ بہت ہے اور ہندی والے ان کو پڑھنا پسند کریں گے۔ اس ہی سال باقر نقوی کے سارے کلام کا ایک مجموعہ '' دامن''۔ جس میں مطبوع اور غیر مطبوع کلام شائع ہوا ہے۔

پاکستان کے مشہور شاعر اور کالم نگار ڈاکٹر حسن رضوی مرحوم نے اپنی کتاب بہ عنوان بالمشافہ میں ایک انٹرویو میں باقر نقوی سے سوال کیا '' آپ نے شعری اصناف میں غزل ہی کو کیوں چنا'' باقر نقوی کہتے ہیں کہ'' نہ جانے کیوں غزل ہی مجھے اچھی لگتی ہے۔ جو بات ایک پوری نظم میں کہی جاتی ہے غزل کے ایک شعر میں سما جاتی ہے اور ایجاز کا یہ کرشمہ ہی غزل کا جادو ہے۔ غزل کا فارسی سے مشتق ہزاروں سالہ خمیر جو ہے اس کا مزہ ہی اور ہے' اس پر غزل کی تہہ داری سونے پر سہاگہ ہے۔'' حسن رضوی کے اس سوال پر کہ '' آپ کے نزدیک زندہ رہنے والا ادب کیا ہوتا ہے؟'' باقر نقوی نے توضیح کرتے ہوئے کہا: '' زندہ رہنے والا ادب وہ ہوتا ہے جو انسان کی آفاقی الجھنوں اور مشکلات کے ضمن میں تخلیق پائے۔ صرف زبان کے چٹخارے یا محاورے بازی سے زندہ رہنے والا ادب پیدا نہیں ہوسکتا اس لئے کہ زبان اور محاورے بدلتے رہتے ہیں۔ ماحول بدلتا رہتا ہے سو جو ادب صرف آج کی زبان اور ماحول پر تکیہ کرے گا وہ تبدیلی کے ساتھ عجائب خانوں میں چلا جائے گا۔'' شاید یہی وجہ ہے کہ باقر نقوی کا روئے سخن ترقی پسند، جدیدیت، اور مابعد جدیدیت ادب کی طرف ہے:

اگر ہمیں اسی مرکز پہ لوٹ آنا تھا   تو سارے خواب بھی کیا ہم نے بے سبب دیکھے

موجودہ ساری تباہیوں اور بربادیوں کے ساتھ ساتھ آج کے انسان کی بے بسی کا بھی باقر نقوی کو احساس ہے۔ ایسے محسوس ہوتا ہے کہ نہ صرف دنیا کی ہر بات بلکہ ہم خود اپنے بس سے باہر ہیں۔ دنیا میں ہونے والے ہر ظلم، ٹیلیویژن ہی کہ ذریعہ سہی ہماری آنکھیں دیکھ رہی ہیں۔

باقر نقوی بنیادی طور پر تو غزل کا شاعر ہے لیکن کچھ نظمیں بھی لکھی ہیں یہ نظم جو انکی ذات کی ترجمانی کرتی ہے۔

رشتہ

گنگا دیس میں بچپن گزرا
گنگا ماں کہلائی
سندھ نگر میں ہوش سنبھالے
سندھ کو باپ کہا اب ہے ٹیمز کنارے ڈیرا
ٹیمز سے رشتہ کر
لندن کی برف جھیل کے آئے ہیں بیس سال   باقرؔ میاں کی گرمئ گفتار دیکھنا

☆☆☆

ساحر شیوی، لیوٹن

گرامی قدر منزلت باقر نقوی صاحب کی خدمت میں خلوص و احترام کے ساتھ

نذرانۂ عقیدت

اک شاعر نامی ہے باقر نقوی — اشعار پہ حاوی ہے باقر نقوی
اردو کا پجاری ہے باقر نقوی — گلزار کا مالی ہے باقر نقوی
فطرت کا جلالی ہے باقر نقوی — کیا شان الٰہی ہے باقر نقوی
اٹھا نہ قدم اس کا ظلمت کی طرف — اک نیک پیامی ہے باقر نقوی
ہے قابلِ تعریف اس کی ہستی — کیا خوب لکھاری ہے باقر نقوی
یہ ادب کو روشنی دیتا ہے — یہ مانا ہے کہ خاکی ہے باقر نقوی
ہو نثر کہ ہو نظم سبھی پر قابو — افکار کا داعی ہے باقر نقوی
ہر فن میں اسے ہے مہارت حاصل — ہر شے میں کمالی ہے باقر نقوی
ہے فکر بھی آئینہ ندرت اس کی — ہر شخص کا حامی ہے باقر نقوی
ہم داد نہ کیوں دیں اس کے فن کی — اردو کا یہ ساتھی ہے باقر نقوی
شہرہ ہے بہت ملکِ ادب میں اس کا — ہر فن میں دوامی ہے باقر نقوی
اردو پہ فدا جان ہمیشہ اس کی — مئے عشق کا ساقی ہے باقر نقوی
خود کشورِ اردو کو اس پر ہے ناز — بے باک یہ والی ہے باقر نقوی
جدت ہے ہر اک شعر میں یارو اس کے — ہر بات میں عالی ہے باقر نقوی
مخمور ہے پی پی کر ے وحدت کی — اللہ سے راضی ہے باقر نقوی
چلتا ہے وہ صدق و صفا پر پیہم — ایمان کا راہی ہے باقر نقوی

اللہ کرے کہ ایسا ہی رہے ہر دم
ساحؔر کا رفیق☆ ہے باقر نقوی

☆ افریقی زبان سواحلی میں ''رفیق'' دوست کو کہتے ہیں

جمیل الدین عالی

چپکے چپکے

اردو غزل ان الزامات سے تو کبھی کی بری ہو چکی کہ وہ محض کلاسیکی روایات کی اسیر ہے...... کہ وہ جدید حسیات مثلاً روایت کے خلاف احتجاج اور انقلابی کش مکش کو اپنے سانچے میں رکھتے ہوئے بھرپور جمالیات کے ساتھ ظاہر نہیں کرسکتی۔ فیض صاحب تو کلاسیکی لفظیات سے استفادہ کرتے ہوئے بھی بڑے بڑے معترضین کے منھ بند کر گئے ہیں، آج ایک پوری اور بڑی طاقتور قطار ہے ایسے غزل گویوں کو جو مستند شعری جمالیات کے راستے بھی تغیر کی طرف بڑھتے اور بڑھاتے جاتے ہیں، ان میں ''تازہ ہوا''، جو لندن سے آرہی ہے، ایک چونکا دینے والے اضافے کا تحفہ لا رہی ہے۔

مجھ جیسے پرانے چاول کے لیے جو سکہ بند نقاد بھی نہ ہو کسی ''نئے'' شاعر کے شعری مجموعے پر رائے زنی بڑا مشکل کام ہے۔ شعر کے معاملے میں میرا تقریباً ہر وقت رواں نثری قلم اپنی بے بضاعتی کے دباؤ سے کانپنے لگتا ہے، میری تربیت اور عادت آہ اور واہ کی اظہاری حدود سے گتھی ہوئی ہے جن سے میں بڑے داخلی اور خارجی تقاضوں کے باوجود نکل نہیں پاتا۔ شاید اس لیے بھی مجھے اس وقت تک شعر پر ''نقد و نظر'' کو اپنا ذیلی پیشہ یا شیوہ بنانے کی فرصت نہیں مل سکی ہے۔

سچ کہ ''تازہ ہوا'' ایک ذمہ دارانہ تبصرہ مانگتی ہے خواہ وہ فلیپ کی صورت میں کیوں نہ ہو۔ اس کے وہ شعر جو نمونے کے طور پر میری نظر سے گزرے (اور نہ جانے پورے مجموعے میں کیا کچھ ہو) ایک بڑے جان دار لہجے کی نشان دہی کرتے ہیں، سانچہ وہی قافیہ ردیف کچھ پرانی لفظیات بھی، مگر بیشتر مصرعے گرج گرج کر اپنی زبان بولتے ہیں: زمیں کی جنگ چھڑے گی اب آسمانوں میں

میں باقر نقوی سے معمولی سی بھی واقفیت کا دعویٰ یا اعتراف نہیں کرسکتا۔ انھیں لندن میں ایک آدھ مرتبہ سنا ہوگا وہ بھی روا روی میں۔ لیکن ان کی جو غزلیں مجھ تک پہنچی ہیں انھیں ایک اہم احتجاج شاعر ہی نہیں ایک بڑا امکان تسلیم کرنے پر مجبور کر رہی ہیں (معذرت کہ میں شعرائے اردو مقیم مغرب کی پی آر مہمات یا تنازعات میں شریک نہیں ہوا کرتا..... تاحال مجھے وہاں روٹی کپڑا مکان...... اور ایک شام.... ان کی مہربانی کے بغیر دوسرے احباب کی قدر دانی سے مل جاتے ہیں۔ یوں بھی ایسے موقعے پر کوئی صیغۂ مبالغہ استعمال کرنا ایک اچھے قاری کو شاعر کی طرف سے شبہے میں ڈال سکتا ہے)۔

آیئے شعروں کے انتخاب سے شاعر کی...... اور چاہیں تو میرے دعووں کی..... رسوائی یا پذیرائی ہوجائے۔ بعض غزلیں مسلسل نہ ہونے کے باوجود وحدت تاثر کے سبب مسلسل لگتی ہیں، ان سے ایک دو شعر کا انتخاب نامناسب ہوگا مگر اس وقت میرے لیے ناگزیر ہے۔

شہر کا لفظ پچھلے بیس برس میں اتنا مجروح کر دیا گیا ہے کہ اس کی معنویت اور حیثیت بگڑ چکی ہے مگر نقوی نے ایک پوری غزل کی ردیف میں لاکر بھی زندہ و تازہ رکھا ہے۔

ناراض ہو کے رات کی پریاں کدھر گئیں — کیوں اس قدر اداس سویرا ہے شہر میں
یہ کیا ہوا کہ رنگ سے عاری ہوئے ہیں پھول — بے رنگ تتلیوں کا بسیرا ہے شہر میں
ہر جزر و مد کے ساتھ بدلتا ہے اپنا رخ — جیسی ہوا ہے ویسا ہی دریا ہے شہر میں

اور کیا یہ شعر کسی بے بسی کا مظہر ہے؟ اے اہلِ ذوق یہ سب کا امتحان ہے۔ دیکھو یہ بات کتنی دور تک جاتی ہے:

کوئی پوچھے جو کبھی گھر تو اسے گھر کہہ لیں — اور ہم ان در و دیوار سے کیا مانگتے ہیں

اس غزل میں ایک شعر تمام پرانی علامتوں کے باوجود ایک آہنگ ہو کر ابھرتا ہے۔ پرانی لفظیات مضبوط ہاتھوں میں آکر توانا ہوجاتی ہیں

کتنے بھولے ہیں ترے شہر کے زخمی پیکر — جو مسیحاؤں کے قاتل سے دوا مانگتے ہیں

فرازِ دار کا ایک مرکب فیض اور مجروحؔ سے منسوب ہے۔ باقر نقوی ان سے متاثر ہوا ہوگا (اور خود یہ حضرات بھی اپنے پیش رووں سے متاثر ہوئے تھے.... اور کون اپنے پیش رووں سے متاثر نہیں ہوتا) لیکن ایک اصطلاح اپنی بنائی اس کی معنیاتی وسعت میں طبقاتی کشمکش کی کہانی واضح تر ہے۔

فرازِ عدل پہ حکام بے ادب دیکھے — گناہگار عجب، فیصلے عجب دیکھے

اس غزل میں ایک اور کہانی..... جب کش مکشوں اور قربانیوں کو عارضی سہی بڑی بڑی دل دوز غیر متوقع ناکامیوں سے دوچار ہونا پڑتا ہے..... یہ داغ داغ اجالا.... پرانی اور تازہ کہانی........ لیکن اپنی زبانی........

اگر ہمیں اسی مرکز پہ لوٹ آنا تھا　　　تو سارے خواب بھی کیا ہم نے بے سبب دیکھے

نہیں... میں اپنی بے بضاعتی اور کم فرصتی میں ایسے دکھوں میں ڈوبے ہوئے غضب ناک اور تہ دار غزل گو پر کوئی تسلی بخش گفتگو نہیں کرسکتا۔ مجھے دوسروں کے بارے میں ژولیدہ بیانی، مبہم بے معنی یا ہم معنی expression پسند نہیں۔ سیدھی سادی زبان میں یہ شاعر مجھے انقلاب کا تجزیہ نگار.... اور پر اعتماد پیشین گو لگتا ہے۔ آنے والے ناگریز کی طرف ڈھکی چھپی ایمائیت کے ساتھ نہیں (گو وہ بھی ایک بڑا مقام ہے) پوری قوت کے ساتھ طاقتور لفظوں کے پرچم ہلا ہلا کر اشارے کرتا ہے۔

اب کے نظر آتے ہیں عجب پیاسوں کے تیور　　　پانی نہ ملے گا تو پیالہ نہ رہے گا

بے کارزمینوں کو نگل جاتے ہیں جنگل　　　روئو گے مسافر کو تو رستہ نہ رہے گا

ہاں ایک پرانا چاول سرگشتۂ خمار رسوم وقیود ہی رہے گا، اتنے خراجِ تحسین کے ساتھ ایک اور بات کہنے کو جی چاہ رہا ہے..... اگر باقر نقوی کے جواہر بیان لفظیاتی تہذیب وترتیب کی خراد پر کچھ اور چھل جائیں تو زیادہ اچھے لگیں گے اور زیادہ کاٹ بھی کریں گے۔

اکثر شعرا کے لیے انگلستان کے قیام میں کئی خوبیاں بھی ہیں مگر ایک کمی بھی، وہ کمی رفتہ رفتہ پوری ہوتی جاتی ہے لیکن تاحال موجود ضرور ہے.... اور وہ ہے خوش نیت، فاضل اہل نظر کا مسلسل inter-action نہ ہونا۔ ایسا inter-action بالآخر ایک غیر محسوس مگر دوررس خود تنقیدی کے مواقع اور ماحول فراہم کرتا رہتا ہے اور classy شعرا تو پاک وہند، آ آ کر ایسی صحبتوں میں ایک لازمے کے طور پر وقت گزارتے رہے ہیں، باقر نقوی ایک classy شاعر ہونے کے بڑے امکان رکھتا ہے، نہ جانے اس کی کیا عمر ہے، کیا پیشہ ہے، وہ اپنے وطن میں کیوں نہیں رہتا.... انگلستان میں اردو شاعری کم زور نہیں لیکن اگر وہاں مستقل رہنے والے اردو شعرا چند برس اور پاک وہند کے اردو ماحول کے دریاؤں میں غوطے کھاتے رہیں تو بہت خوبصورت تیریں گے۔

ایک بار پھر چند شعر سامنے آتے ہیں اور باقر نقوی کے امکانات ہی نہیں (مجھے تو اتر استعمالِ ''امکانات'' پر کوئی افسوس نہیں) بلکہ اس کے ''منفرد'' کمالات بھی دکھاتے ہیں، تلخیوں، تنبیہوں، عزائم کا ایک دھارا ہے جو تیز بہہ بہہ کر پھیل رہا ہے:

اُگے نہ موت زمین پر تو اور کیا ہوگا　　　کہ بیج زہر کے بانٹے گئے کسانوں میں

کچھ اور تازہ رنگ بھروں کائنات میں　　　اے جذبۂ خیال نئے پر لگا مجھے

جاری ہو نغمۂ حیات تار رباب کچھ تو بول　　　کب سے ہے منتظر بہار، میرے گلاب کچھ تو بول

یہ آدمی غزل میں انسانی جدوجہد کی تاریخ کیسی دل میں اتر جانے والی اور حوصلہ بڑھانے والی تبلیغ کے ساتھ بیان کرتا ہے:

کمال پانیوں کا تھا کہ راستے بنالیے　　　ندی کی راہ میں مہیب کوہسار کب نہ تھا

یہ آدمی کس چیلنج کے ساتھ میدان مانگتا ہے:

یہ کیا کہ اک اڑان ہی میں کٹ گئیں مسافتیں　　　عطا کیے ہیں بال و پر تو ہم کو آسماں بھی دے

یہ آدمی غزل کی مخصوص جمالیات میں انقلاب کے آداب کس اعتماد، کس دانش کے ساتھ بناتا ہے۔

سبک سری میں بھی اندیشۂ ہوا رکھنا　　　سنگ اٹھے ہو تو جلنے کا حوصلہ رکھنا

اور اس غزل میں دوسرے عجیب عجیب رنگ بھی ہیں۔ ہماری پرانی زبان میں کس قادرالکلامی کے ساتھ........ کس قدر تلخ........ کتنی سچائی کے ساتھ تلخ ہو جاتا ہے:

یہ زینتیں بھی عجب ہیں یہ سادگی بھی عجیب　　　ریا کے سارے ہنر جسم پر سجا رکھنا

نہ جانے کو ن سا کس وقت کام آجائے　　　سو ایک جیب میں بت ایک میں خدا رکھنا

اور اس گھٹن میں اوّلیت کس مطالبے کو دیتا ہے:

پھول ہم نے کبھی مانگے نہ صبا مانگتے ہیں　　　ہم تو جینے کے لیے تازہ ہوا مانگتے ہیں

بقیہ صفحہ 32 پر

پروفیسر ڈاکٹر سید محمد عقیل رضوی

کئی باتیں

فکر ونظر کی نئی آگہی نے ادھر انسان کو پھر سے اپنی بدلتی ہوئی قدروں کی تلاش کی طرف متوجہ کیا ہے۔ نئے سائنسی حقائق جس طرح روز، ایک نیا انکشاف کرتے جاتے ہیں اسی طرح، ذہنِ انسانی اپنے غم ونشاط، اپنے احساسِ جمال اور اپنے محسوسات کے لیے اظہار کے نئے طریقے دریافت کرتا جاتا ہے۔ کمپیوٹر اور روبوٹ کی برق رفتاری نے نہ صرف اس کی مشینی دنیا کو متزلزل کر دیا ہے بلکہ اس کی سوچ کے ادب اور ادراکِ خیال میں بھی ایسا محشرستان برپا کر رکھا ہے کہ شعر وادب کی دنیا میں یہ صورت پہلے کہاں تھی اور عجیب بات یہ ہے کہ آج سے کچھ دنوں پہلے تک غزل، جسے حالؔی سے لے کر ترقی پسندوں تک نے اردو شاعری کے دورِ ازل کا سرمایہ سمجھ رکھا تھا۔ دیکھتے دیکھتے اردو ادب کی دنیا پر پھر سے حاوی ہوگئی۔ روز، نت نئے انداز کی غزلیں، نئی گلاسری اور نئے انداز سے سوچتی ہوئی، ایوانِ غزل میں داخل ہوتی جا رہی ہیں۔ یہ غزل کی یک بارگی بازآفرینی کیوں اور کیسے ہو رہی ہے اور غزل روز نئے موڑ، نئے مسائل اور نئی گلاسری کیوں بدل رہی ہے، اس کا تجزیہ ہونا چاہیے۔ ایک بہت واضح موڑ اردو غزل میں اردو کے شعرائے مہجر کا ہے۔ وہ شاعر جو ہندوستان اور پاکستان سے نکل کر اطرافِ عالم میں پھیل گئے ہیں۔ جن کے ساتھ ان کا قدیم کلچر بھی ہے اور جدید بھی۔ ان میں وہ بھٹک بھی ہے جو انھیں لیے پھرتی ہے اور تجربوں وتہذیبِ غم کی نئی دنیا بھی جو ایسے تمام لوگوں کی اپنی دنیا ہے۔

باقر نقوی کا مجموعہ ''تازہ ہوا'' مجھے ملا تو غزل کی ایسی ہی دنیا ان کے اشعار میں مجھے نظر آنے لگی اور چونکہ میں ان کی جڑوں، ان کے منتقل ہوتے ہوئے ماحول، ان پر پڑی ہوئی تمام بپتا سے واقف تھا، اس لیے ان کے اشعار میں مجھے وہ تمام صورتیں سر جھکائے، سر اٹھائے اور متوحش و بے چین نظر آنے لگیں۔ میں پہلے سمجھا تھا کہ وہ اپنے گھر کے پرانے لوگوں کی طرح محض تفننِ طبع کے لیے شعر کہتے ہوں گے کہ محفل سازی بھی شاعری کی ایک منزل رہ چکی ہے۔ یہ ایک جملۂ معترضہ ہے مگر آج بھی مغرب میں محض ''تفننِ طبع'' کے دل دادہ موجود ہیں۔ ایسے خاصے بھولے بھالے لوگ برطانیہ، امریکا اور کینیڈا میں ہیں جو شاعر اردو شاعری کی حشر سامانیوں سے بے خبر ہیں اور جس تہذیب اور رنگِ شاعری کے دور میں انھوں نے ہجرت کی تھی، وہ سمجھتے ہیں کہ وہی تہذیب اور رنگِ شاعری آج بھی اردو شاعری کا غالب رنگ ہے اور اسی رنگ میں شعری تخلیق کرتے رہتے ہیں۔ مگر باقرؔ نے ایسے سن وسال میں ہجرت کی تھی کہ انھیں خبر بھی نہیں کہ اس وقت محفل سازی کی شاعری کیا تھی۔ ہاں، اس زندگی کی یاد ضرور باقی ہے۔ اسی کے ساتھ وہ تجزیہ بھی جو انھیں کھوکھراپار سے کھینچتا ہوا کراچی اور پھر لندن لے گیا۔ اگر یہ سب کچھ نہ ہوتا تو میں شعری تجربہ کہاں سے آتا۔

حرکت میں ہے دنیا لیکن پتھر ہے — پتھر کے اندر رقصندہ ہم ہی تو ہیں

پیڑ کاٹے گئے، پھول روندے گئے بہتے دریاؤں پر بند باندھے گئے — جانے کتنے بسیرے اجاڑے گئے تب بسائی گئی ہیں نئی بستیاں

کنبہ چھوڑا بستی چھوٹی جنگل ہوگئے ہم — جاناں تیرے پیار میں کیسے پاگل ہوگئے ہم

باقرؔ نے اس کا اہتمام کیا ہے کہ وہ اپنے تجربات کو نالہ وفریاد کی طرح بیان نہ کریں۔ جو کچھ ان پر بیت گئی، اس کا مداوا کیا ہو سکتا ہے؟ پھر ہائے واویلا مچانے سے کیا؟ جو گھر لٹ گیا، جو زمین چھوٹ گئی، جو آم کے باغ اور چنے کے کھیت ان سے بچھڑ گئے انھیں کون واپس لا سکتا ہے۔ اس لیے ان کی غزلوں میں اس تہذیب کیے ہوئے غم کی بازگشت ہے جو برداشت کر لینے کے بعد ایک ایجابی احتجاج کے ساتھ ابھرتی ہے، جسے سنانا مقصود نہیں ہوتا مگر ''ہم نے بھی یہ کچھ برداشت کیا ہے۔ لوگو! تم سن کر کیا کرو گے تاہم یہ ہمارا تجربہ، ظرف اور غم کو حرزِ جاں بنانے کا طریقہ دیکھو'' جیسا آہنگ اور اشارہ ان غزلوں میں بولتا سنائی دیتا ہے۔ تمام ہجرت کرنے والوں کے یہاں کسی نہ کسی صورت میں یہ کیفیت ابھرتی ہے مگر باقرؔ نے اسے دبا کر، جو اپنے الفاظ اور مصرعوں کے چہروں سے عیاں کرنے کی فکر کی ہے، وہ ان کی اپنی منفرد کوشش ہے۔ وہ کہیں vocal نہیں ہوتے اور نہ ''ہائے سب لٹ گیا۔ ہم بے گھر ہوگئے'' والا expression ملتا ہے۔

گھر سے نکلے تو یہ غم تھا بے گھر ہوگئے ہم
تیری بستی میں پہنچے تو پتھر ہوگئے ہم

جن پہ لٹکے ہوئے اک عمر گزاری ہم نے
ان صلیبوں پہ ذرا کوئی مسیحا چمکے

لوگ کوئی تصویر لیے پھرتے ہیں گلی گلی
ہم کو بھی وہ چہرہ کبھی دیکھا سا لگتا ہے

سوادِ شام میں گم ہوگئے چراغِ امید
نگاہِ وقت نے کیا حادثے غضب دیکھے

پھول ہم نے کبھی مانگے نہ صبا مانگتے ہیں
ہم تو جینے کے لیے تازہ ہوا مانگتے ہیں

خود بخود جل اٹھے یادوں کے دریچوں میں چراغ
رات پھر جاگ اٹھا درد پرانا دل کا

مگر باقر نے کلاسیکی پابندیوں کا لحاظ رکھا ہے۔ خیالات اور الفاظ کی حدیں یقیناً پرانے رکھ رکھاؤ کو توڑ دیتی ہیں مگر، الفاظ کا دروبست، بحروں کی پابندی، الفاظ کے اعراب وہ اس طرح نہیں جوڑتے جس طرح جدید اور بہت سے نئے شعراء، کچھ تو تجربوں کے لیے اور زیادہ تر ناواقفیت کے سبب، زبان کی شکست وریخت کے عمل میں سرگرم ہیں اور اسے سراہتے بھی ہیں۔ زبان کے دائرے، اعراب واصوات اگر زبان کے اصولوں کے ساتھ تبدیلی اور شکست وریخت کی منزل سے گزریں اور یہ تبدیلی فطری ہو تو شعری زبان کا ارتقا ہوتا ہے مگر لاعلمی اور من مانی کیفیت، شاعری اور زبان، یہاں تک کہ شاعر کے فکر عمل کو بھی بے مصرف کر دیتی ہے۔ یہی صورت استعارات کی بھی ہے۔ نئی زندگی اپنے نئے استعارات اور علامتیں بنا سکتی ہے اور بناتی بھی ہے مگر اس عمل میں کسی بھی زبان کی شعری روایت کو یک قلم پسِ پشت نہیں ڈالا جاسکتا اور تمام تلازمے اور استعارے شخصی طور پر اور isolation میں پیش نہیں کیے جاسکتے۔ یہ ضرور ہے کہ شاعر ان کے منطقے spheres اور اشاریت کو بدل سکتا ہے اور بدلتا بھی ہے۔ اس سے نئی معنوی وسعتیں بھی پیدا ہوتی ہیں اور نئے تلازموں کا صرف بھی شاعری کی دنیا میں داخل ہوتا ہے مگر اس میں زبان کے مزاج، اس کی assimilation کی طاقت اور تمام تر حدود وتوسیع کو نظر میں رکھنا چاہیے۔ باقر نے ہوا، پرندہ، پھول، گرد، دریا، دھوپ اور برف کو جس طرح تلازمۂ خیال کے لیے استعمال کیا ہے اس میں ہر لحظہ ایک نئی معنویت اور ماضی وحال کی زندگی کے ممکنات ڈوبتے ابھرتے رہتے ہیں اور اس طرح ان کی غزلیں زبان وبیاں دونوں کی نئی معنوی تہیں ابھارتی جاتی ہیں۔

ہر دور کا شاعر اپنے دور کے آہنگ، فیشن اور آگہی کو کہاں چھوڑ سکتا ہے؟ کیوں کہ تمام تحریریں ایک وقت اور تاریخ کے ساتھ وجود میں آتی ہیں جن میں فیشن ادیب اور شاعر کو ڈھکاتا ہے۔ اگر چہ یہ فیشن کبھی کبھی بڑے دھوکے باز Illusive بھی ہوتے ہیں اور ضروری بھی نہیں کہ تاریخ اور وقت کی سچی حقیقتیں بھی ہوں مگر شاعر اور ادیب اس کی طرف کھنچتے ضرور ہیں۔ پھر سچی حقیقتیں اور تجربے بھی اب طبیعات، مابعدالطبیعات، ایٹمی تجربوں اور اکسرے کی گہرائی سے آتی ہوئی تجرباتی زندگی سے آتے ہیں کہ کہاں کہاں ادیب یا شاعر تسلیم شدہ قدروں کے ساتھ چلے اور پھر کن مسلمات کی قدروں کے ساتھ روایت سے الگ بھی ہو جائے۔ اردو کی نئی شاعری میں کچھ لوگ نئے مسلمات اپنا کر اپنے طور پر الگ ہو بھی گئے مگر کچھ دنوں بعد معلوم ہوا کہ جنھیں وہ نئے شعری مسلمات سمجھتے تھے، وہ ایجاد بندہ اور محض لمحاتی دلچسپیوں سے زیادہ کچھ نہ تھے۔ کچھ تذبذب میں بھی رہے مگر میرا خیال ہے کہ جنھوں نے زبان اور بیان کے کینڈے کو بدلا اور اس بدلنے میں فیشن کے ساتھ ساتھ اردو کی شعری روایت اور اس کے مزاج اور حرمت کا خیال رکھا ہے، انھوں نے اردو شاعری کے شعری ارتقا میں مدد کی ہے۔ اور یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے اپنا ماڈل ایسے شعرا کو بنایا ہے جو اگر چہ نئے تھے مگر اردو غزل کی شعری تحریم کا لحاظ کرتے رہے ہیں۔ باقر کی غزلوں پر اپنی آواز کے ساتھ ساتھ ناصر کاظمی، شکیب جلالی اور کہیں کہیں منیر نیازی کی گہری چھاپ بھی نظر آتی ہے اور فیشن ان کا غزل کا نیا فیشن ہے۔ زبان کے معاملے میں وہ کبھی کبھی جمیل الدین عالی، ناصر شہزاد اور ابنِ انشا کی طرف بھی دیکھ لیتے ہیں مگر اس میں انھیں کامیابی نہیں ہوتی کہ وہ کلاسیکی رکھ رکھاؤ چھوڑ نہیں پاتے ہیں۔ یہی سب صورتیں باقر کی غزل گوئی کا واضح نشان مجھے معلوم ہوتی ہیں۔ ان میں وہ نئی شعری روایت بھی ہے اور مسلماتِ شاعری کی تحریم بھی جس کا ذکر ابھی کیا گیا۔ اب باقر کے کچھ منتخب اشعار دیکھیے:

ہے گیسوؤں کا فیض جو نم ہے گھٹاؤں میں
خوشبو ترے بدن کی گھلی ہے ہواؤں میں

مٹ کر ہوا جو اور تماشائے روزگار
میں وہ نوشتۂ ورق آبدیدہ ہوں

میں بھی ترے سپاس کا امیدوار ہوں
میرا بھی ایک تار ترے پیرہن میں ہے

ہم اپنے لیے آپ ہی بن جائیں گے سایہ
دیوار کے سایہ پہ بھروسا نہ کریں گے

خوشبو تری گلی میں پریشاں ملی ہمیں
کیا پھر الجھ پڑا ترا آنچل ہوا کے ساتھ

روشن ہے کوئی بام، نہ شمعیں ہیں دروں میں
کیوں لوگ چھپے بیٹھے ہیں کاغذ کے گھروں میں

کیسا یہ شہر ہے کہ جو آباد ہے مگر
دیکھو بلندیوں سے تو صحرا دکھائے دے

کس کو چاہوں، کس سے بولوں، خول سے کیسے نکلوں
گھر کے اندر چپ کا جادو، باہر تیز ہوا ہے

باقر جی خوش قسمت ہو تم کوہِ نور پہ بیٹھے ہو
چپ کی کالی جھیل میں دیکھو کتنے سخنور ڈوب گئے

سنا ہے اب کے برس برف گر رہی ہے بہت
تمھارے باغ کے سب پھول جل گئے ہوں گے

سوادِ شام میں گم ہوگئے چراغِ امید
نگاہِ وقت نے کیا حادثے غضب دیکھے

یہ سب تو ہے مگر باقر میاں فکر میں تھوڑی اور گہرائی پیدا کرو، دل کو کچھ اور جلاؤ، تب داستانِ دل، اپنے وقت کی آواز میں بیان کر دو۔ پھر دیکھو کہ تم کہاں ہو۔ اچھی شاعری، خودنگری اور خود احتسابی سے وجود میں آتی ہے، مشاعرے کی واہ واہ سے نہیں۔ مشاعرہ لوٹ کامیابیاں ادب کے میدان میں شاعر کو اکثر پیدل کر دیتی ہیں۔ خدا نہ کرے کہ تم مشاعرہ لوٹ شاعر بنو اور تمھارا یہی ایک مجموعہ تمھیں ادب میں زندہ رکھنے کے لیے کافی ہو۔ میں یہ بددعا تمھیں نہیں دے سکتا۔

☆☆☆

بقیہ: تازہ نگار شاعر...... باقر نقوی صفحہ : 14

کسی کی طرز فکر اور انداز نظر پر ستائش کے کلمات بھی ادا کیے جاسکتے ہیں اور ''شہر کے اندیشے'' کا طعنہ بھی دیا جا سکتا ہے۔ تاہم تخلیق کا کرب اور اظہار کی سرخوشی کسی کے ردو قبول کی پابند نہیں ہوتی۔ یہ تو انسانی وجود کے ارتقا کے دوران فطری انتخاب (Natural Selection) کا خاصہ ہوتا ہے جو کسی کو آزر اور کسی کو ابراہیم بنا دیتا ہے۔ کنفیوشس کا ایک قول ہے **It is better to light a candle than to curse the darkness**

(اندھیرے کی مذمت کرنے سے بہتر ہے کہ اپنے حصے کی ایک شمع روشن کر دی جائے) باقر نقوی کا مسلک بھی یہی ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ بقول ساقی امروہوی

ع------ایک تنہا مری آواز کہاں تک پہنچے

لیکن وہ روشنی کے اعلان کی اہمیت پر یقین رکھتے ہیں ۔

اک جگنو سے رات نہیں روشن ہوتی پھر بھی
کر دیکھو اعلان اُجالا بڑھتا جائے گا

باقر نقوی کی شاعری کے مطالعے، انفرادیت کی نشان دہی اور مجموعی استحسان کی جس منزل تک میں خود کو لانا چاہتا تھا، میرا خیال ہے میں اس میں کچھ نہ کچھ کامیاب ہوا ہوں۔ اب آخر میں مجھے ایک بات ضرور کہنی ہے۔

ہمارے آج کے بیشتر نقاد، خصوصاً سن رسیدہ ناقدین، اکثر یہ بات کہتے ہوئے پائے گئے ہیں کہ دورِ حاضر کی اردو شاعری عموماً اور غزل خصوصاً یکسانیت کا شکار ہے۔ سب شاعر ایک ہی طرح کا لکھ رہے ہیں۔ یہاں تک کہ کسی غزل پر سے ایک شاعر کا نام ہٹا کر کسی اور شاعر کا نام چسپاں کر دیا جائے تو کوئی فرق ہی محسوس نہ ہوگا۔

ایسے ناقدین کو میرا مخلصانہ مشورہ ہوگا کہ وہ بے خبری اور تن آسانی کے خول سے باہر نکل کر کم از کم باقر نقوی کے ''دامن'' پر ایک نظر ڈال لیں اور پھر فیصلہ کریں کہ کیا یہ دامن دوسرے تمام دامنوں کی طرح ہے یا اس میں دامن یوسف کی سی انفرادیت پائی جاتی ہے۔

☆☆☆

پروفیسر سحر انصاری، کراچی

تازہ نگار شاعر------- باقر نقوی

باقر نقوی بہت اچھے شاعر ہیں۔ اُن کے کلام کا مطالعہ کرکے اور ان سے مل کر یہ خیال آتا رہا کہ اتنے اچھے شاعر سے اتنی مدت تک بے خبر کیسے رہا۔ اس کا جواب باقر نقوی کی اقامتِ لندن میں مضمر تھا۔ انہی کے بقول باقر نقوی نے بیس سال تک لندن کی اوس جھیلی ہے۔ یعنی کھائی نہیں ورنہ ہم میر انیس کا مصرعہ دہراتے ع-------- کھا کھا کے اوس اور بھی سبزہ ہرا ہوا

وہ تو خدا بخشے ہمارے عزیز دوست حسن اجمل مسرت کا کہ وہ انگلستان اور آئرلینڈ کے قیام کے دوران ہمیں وہاں کی ادبی سرگرمیوں سے بھی آگاہ کرتے رہتے تھے۔ اب W.B.Yeats کی صد سالہ تقریبات منائی جا رہی ہیں۔ فلاں فلاں کتابیں شائع ہوئی ہیں، کتابوں کا ایک سیٹ بھیج رہا ہوں۔ جیمز جوائس کے Dubliners کا صد سالہ ایڈیشن منظر عام پر آ رہا ہے۔ مسرت ہی نے ایک خط میں مجھے لکھا کہ لندن کے ایک مشاعرے میں باقر نقوی کو سنا ان کا یہ شعر بہت پسند آیا۔

نہ جانے کون سا کس وقت کام آجائے　　　سو ایک جیب میں بت، ایک میں خدا رکھنا

شعر واقعی مجھے بہت اچھا لگا۔ دورِ حاضر کی منافقت، چالاکی، زمانہ سازی اور سیاست بازی پر کس سلیقے سے طنز کیا ہے۔ ندرتِ مضمون اور اسلوبِ سخن کی داد بے اختیار ہونٹوں پر آگئی۔ بسا اوقات میرے لیے کوئی ایک شعر، کوئی ایک تحریر برسوں تک جزوِ ذہن بنی رہتی ہے۔ دوست احباب کو، شاگردوں کو، ادبی محفلوں کے شرکا تک موقع محل کی مناسبت سے اپنی پسند اور تاثرات پہنچاتا رہتا ہوں۔ یہی حال باقر نقوی کے اس شعر کا ہوا۔ جس نے بھی سنا، جھوم اٹھا اور مضمون کے نئے پن اور طرزِ ادا کی داد دی۔

پھر ایک روز کہیں سے ''تازہ ہوا'' میسر آگئی۔ سب سے پہلے وہی غزل تلاش کی جس کا یہ شعر مجھ تک آیا تھا۔ باقر نقوی سے غائبانہ اُنس ہوگیا۔ پھر جب وہ ملے اور ملتے رہے تو ان کی شخصیت کا جادو بھی ہم پر خوب خوب اثر انداز ہوا۔ مہذب، خلیق، شائستہ ہونے کے ساتھ ساتھ کھرے اور ستھرے انسان ہیں، لگی لپٹی نہیں رکھتے۔ آنکھوں میں ذہانت اور شرارت کی چمک عینک کے شیشوں کے عقب سے نظر آتی رہتی ہے جس کا اظہار اور ثبوت ان کی گفتگو اور بذلہ سنجی سے ملتا رہتا ہے۔

اپنے پیشے میں تو باقر نقوی کچھ ہوں گے ہی ضرور، جو اتنے بڑے عہدے پر فائز ہیں، لیکن کلوننگ، برقیات اور نوبیل انعام یافتگان جیسی کتابیں تحریر کرکے انھوں نے اپنے علم و آگہی کی وسعت اور گہرائی کو بھی منصۂ شہود تک پہنچا دیا۔

میرے خیال میں فطری ذہانت اور طبعی تخلیقی جوہر کے ساتھ ساتھ شاعر کا مشاہدہ اور مطالعہ بھی وسیع اور ہمہ جہت ہونا چاہیے۔ اس کے بغیر شاعر یا ادیب محدود خیالات، مخصوص لفظیات اور کم تر واقفیت کا شکار ہوکر نہ صرف چند الفاظ و مضامین کو بلکہ خود اپنے آپ کو دہراتا رہتا ہے۔ باقر نقوی کے کلام کا تنوع ان کی سب سے پہلی انفرادیت ہے جو پڑھنے والے کو متاثر کرتی ہے۔ وہ سیر و سفر کی بنا پر دنیا کے رنگ ڈھنگ بھی بہت قریب سے دیکھ چکے ہیں، عالمی فیصلوں اور نشیب و فراز پر بھی ان کی گہری نگاہ ہے اور ان کا مطالعہ بھی وسیع ہے۔ اس میں مشرق و مغرب کا کلاسیکی ادب اور جدید رجحانات، سب کچھ موجود ہے۔ گنگا جمنی تہذیب، اس کے متعلقات اور اسی مناسبت سے لفظیات بھی اُن کی شاعری کو دوسرے معاصرین سے مختلف بناتے ہیں۔

باقر نقوی کے جو شعری مجموعے اب تک شائع ہو چکے ہیں ان کے نام یہ ہیں: تازہ ہوا، مٹھی بھر تارے، موتی موتی رنگ، بہتے پانی کی آواز۔ حال ہی میں ان شعری مجموعوں کا مجموعہ ''دامن'' کے نام سے منظر عام پر آچکا ہے۔ تازہ ہوا کی پہلی اشاعت مئی ۱۹۸۸ء میں ہوئی۔ اس کے بعد باقر نقوی کے تخلیقی اور تالیفی کارنامے تسلسل کے ساتھ منصۂ شہود پر آ رہے ہیں۔

باقر نقوی کے کلام کے مطالعے کے دوران برابر یہ احساس ہوتا رہتا ہے کہ فطری، وہبی اور وجدانی ہونے کے ساتھ ساتھ شعور، آگہی اور غور و فکر کی آمیزش بھی ہر جگہ پائی جاتی ہے۔ وہ روایتی اور پیش پا افتادہ باتوں میں بھی ایک نیا زاویہ پیدا کر لیتے ہیں۔ اس کی ایک مثال یہ ہے کہ اردو میں عام طور پر یہی کہا جاتا ہے کہ

خدا ہمارے سروں پر ماں باپ کا سایہ قائم رکھے۔اب دیکھئے ماں کے بارے میں باقر نقوی نے کس رُخ سے بات کہی ہے۔سایہ اور روشنی کے فرق کو محسوس کیجیے ؎

مشعلِ جاں لے کے مجھ کو راہ دکھلاتی رہی — اور مائیں ہوں گی سایہ ، میری ماں ہے روشنی

میرا خیال ہے کہ اس ایک مثال ہی سے باقر نقوی کے ذہن اور ان کے تخلیقی طریقہ کار کا بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے اور یہ انداز فکر اور اسلوب بیان ان کے کلام میں غالب عنصر کی حیثیت رکھتا ہے۔

باقر نقوی کی ذاتی زندگی ، اس کی دھوپ چھاؤں ، ان کی تعلیمی ونظریاتی تربیت ، خاندانی ماحول اور ان کی شخصیت پر اثر انداز ہونے والے تجربات و واقعات سے میں قطعی لاعلم ہوں۔اسی لیے ان کی شاعری کا کوئی **Biograpical** یا سوانحی پس منظر میرے پاس نہیں ہے۔میں نے تو چند ملاقاتوں کے علاوہ زیادہ تر باقر نقوی کو ان کی شاعری ہی کے ذریعے جانا اور سمجھا ہے۔یہی شاعری مجھے بتاتی ہے کہ وہ بنیادی طور پر سماجی شعور اور ترقی پسند آدرشوں کو اہمیت دیتے ہیں۔

انسان کی عام زندگی ، اس کے مسائل انھیں پریشان ومضطرب رکھتے ہیں اور ان کی سوچ کا سلسلہ انسانوں کے مابین مفادات کی جنگ کے نقطہ آغاز سے گزر کر سیاراتی فتوحات ، اسٹار وار اور کلوننگ تک پہنچ جاتی ہے۔جب کارخانوں میں انسان بنائے جائیں گے ؎ زمیں کی جنگ چھڑے گی اب آسمانوں میں

ہوس کے دیو سمندر میں زہر گھولیں گے — ہوائیں آگ لگائیں گی بادبانوں میں

سوادِ جہل کے زنداں میں بند ہوگا خدا — بنائے جائیں گے انسان کارخانوں میں

یہ جدید دور کی آگہی اور اس سے پیدا ہونے والا ایک عذاب دانش ہے جسے اقبال نے عذابِ دانش حاضر کا نام دیا ہے۔اس عہد کا ہر حساس اور باشعور انسان اس عذاب سے گزر رہا ہے۔باقر نقوی بھی اس سے الگ نہیں ہیں اور یہ عذاب دانش صرف سائنس ،ٹیکنالوجی ، سیاست اور معیشت کے حوالے ہی سے نہیں ہے ، انسان کے جذبوں ، رویوں اور زندگی کی عام کامیابیوں اور ناکامیوں سے بھی ان کا گہرا تعلق ہے۔اس پس منظر میں باقر نقوی کے ان متفرق اشعار کو پڑھیے اور محسوس کیجیے ؎

کوئی پوچھے جو کوئی گھر ، تو اسے گھر کہہ لیں — اور ہم ان درودیوار سے کیا مانگتے ہیں

کلاہِ کذب و قبائے ریا سے بہتر ہے — کہ آدمی کے بدن پر کوئی لباس نہ ہو

مٹ کر ہوا جو اور تماشائے روزگار — میں وہ نوشتہ ورقِ آبدیدہ ہوں

چشمِ بے نور پہ رنگوں کا اثر کیا ہوگا — بند کانوں کے لیے تازہ خبر کیا ہو گی

خلوتوں میں تو ملے حق کے پرستار بہت — بات کر سکتے ہیں دل کی ، سرِ منبر کتنے

آڑی ترچھی سی مقدر کی لکیریں دو چار — کیا تھا ہاتھوں میں ترے رنگِ حنا سے پہلے

ہمارے بعد کا انساں عجب نہیں کہ پھرے — لیے سر اور کسی کا خود اپنے سر کی جگہ

سانحوں کو دیکھتے ہیں اس طرح اہل نظر — جیسے گہرے رنگ کے شیشے سے گرہن دیکھنا

ہمارا حق ہے کہ ہم کچھ کہیں ، کہیں نہ کہیں — غزل ہماری کسی ملک کا ترانہ نہیں

جیسا کہ کہا جا چکا ہے باقر نقوی نے اپنی زندگی کا خاصا بڑا حصہ دیارِ مغرب میں بسر کیا اور اب بھی وہ وہاں سے بالکل الگ نہیں ہوئے ہیں۔انھوں نے وہاں کی زندگی کو قریب سے دیکھا اور اجنبی دیار میں جو رنگینیاں اور نیرنگیاں نظر آئیں انھیں محسوسات کی سطح تک لا کر شعری قالب میں ڈھال دیا۔وہاں کی طرزِ تعمیر ، رہن سہن اور مظاہر فطرت کے انوکھے گوشے اس طرح اجاگر کیے گئے ہیں۔مشینی معاشرے کے یہ رُخ پہلی بار اردو غزل میں آرہے ہیں ؎

کب تک ترسیں گی آنکھیں ، آسمانوں کے لیے — اب چھتیں بنواؤ شیشے کی ،مکانوں کے لیے

ہم نے خود دیکھا ہے چڑیوں نے بھی تنکوں کے عوض — دھات کے ٹکڑے چنے ہیں آشیانوں کے لیے

پھولنے پھلنے کے قابل ہوں جو پانی کے بغیر — ایسے پودے ڈھونڈنے ہوں گے چٹانوں کے لیے

ہم نے اک اخبار میں دیکھا انوکھا اشتہار — ہے ضرورت چند سانپوں کی خزانوں کے لیے

ساحل کی دھوپ اور لباسِ برہنگی ہے کس کو ہوش، جیب و گریباں کیا ہوئے
خوش بو کا طلب گار بنا پھرتا ہوں ورنہ کہنے کو تو ہر پھول کھلا ہے مرے گھر میں
پہلے لہو لہان بدن کر دیا گیا پھر تحفتاً سفید قبا دی گئی ہمیں
آم کی ڈالی نہ جھولے اور نہ کوئل کی پکار میری آنکھوں کو پڑا ہے کیسا ساون دیکھنا

شعری کلیات ''دامن'' کا آخری حصہ ''بہتے پانی کی آواز'' پر مشتمل ہے۔ اس مرحلے تک آتے آتے باقر نقوی کے اندازِ بیان میں مزید حقیقت پسندی در آئی ہے۔ طنز و بغاوت کا ذائقہ اور گہرا ہو گیا ہے۔ اس کا سبب شاید یہ ہو کہ بساطِ عالم پر جو مہرہ بازی، دہشت گردی اور استحصال کی نئی صورتیں گزشتہ چند برسوں میں اُبھری ہیں، ان کو محسوس کرنے اور پیرایہ اظہار میں لانے کے لیے ممکن ہے باقر نقوی کو یہی اسلوب مناسب معلوم ہوتا ہو۔

گہن میں ہو جب بھی مقدر کا چاند بدل اپنا گھر اور چل کوئی چال
بنے کام سب کیسی رفتار سے یہ دولت کے پہیوں کا دیکھو کمال
پلٹ آئیں گے دن پھر اصنام کے رہا گر یہی اہلِ ایماں کا حال
نہیں کوئی بھی چیز دائم یہاں تمہارا عروج اور نہ میرا زوال
وہ قریہ ہے جو فقط سنگ و خشت کا جنگل ہم اس کو شہر کی صف میں شمار کرتے رہے
انگلیاں میری چراغوں کی طرح روشن تھیں اہلِ ظلمات سے میں ہاتھ ملاتا کیسے

اسی دور میں شاید انھیں اپنے ناقدین اور قارئین کی طرح یہ احساس بھی ہو چلا ہے کہ غزل مسائل و مصائب، دانش و فراست، تغیرات و تضادات، اسرار و رموز کائنات کی طرف زیادہ مائل ہو گئی ہے۔ جبھی ایسے اشعار نوکِ قلم پر آ رہے ہیں۔

کوئی مہکتی غزل لکھو دکھ کی باتیں چھوڑو یار
دکھ کے خط مت لکھا کر بھیجا کر بوسوں کے تار
کرتے ہو روز بحث بہت شہرِ یار سے باقر تمہارے دل میں کوئی ڈر نہیں ہے کیا

باقر نقوی مشینوں کی تہذیب، سنگ و خشت کے جنگل اور سود و سرمایہ کی کشاکش سے گزرتے ہوئے اپنے ماضی کی روایات و اقدار کو بھی پل پل یاد رکھتے ہیں۔

ٹیمز کنارے کھڑا ہوا ہوں کیسے سنہرے بال لہروں کو اب کیا بتلاؤں اپنے بارے میں

ٹیمز کی لہروں نے سنا ہو یا نہ سنا ہو لیکن گزشتہ زندگی کے حوالے بڑے رچاؤ اور والہانہ سرخوشی کے ساتھ یوں بھی اُبھرے ہیں۔

سانسوں کی خوشبو سے میری مہک اٹھا مرا گاؤں بچھڑی مٹی لپک لپک کر چومے میرے پاؤں
تم ہی کہو پنچھو یہ کوئی دیس ہے یا پردیس باپ کی جیسی دھوپ جہاں کی، ماں کی جیسی چھاؤں
کوئی مورکھ ہی ہو گا جو کرے گا اس سے بیر جس دھرتی پر چلا ہو اک دن ننھے ننھے پاؤں
دھول بھری پگڈنڈی تو ہی بھر دے میرے گھاؤ پکے رستوں پر چل چل کر چھل گئے میرے پاؤں

آخری شعر میں جو کرب سمٹ آیا ہے اس سے صرف باقر نقوی ہی نہیں ہر وہ شخص متاثر ہو گا جو ماضی و حال کی دو مختلف دنیاؤں کے مابین تگ و دو میں مصروف ہے۔ ترکِ سکونت یا ہجرت کا اولین انداز تو ایسا ہی ہوتا ہے کہ ذرا نئی سرزمین کی سیر کر آئیں پھر اپنا قدیم رابطہ بحال کریں گے۔ لیکن نئی سرزمین اتنی آسانی سے کہاں چھوڑتی ہے۔

ہاں ارادہ تو یہی تھا کہ گئے اور آئے پاؤں مٹی میں ہوئے ایسے گرفتار کہ بس

باقر نقوی کی شاعری میں سوچتا ہوا ذہن، مشاہدہ کرتی ہوئی آنکھیں اور کرب سہتا ہوا دل ایک مستقل کیفیت کی اکائی بن کر سارے تخلیقی عمل کو ایک احساسی تجربہ بنا دیتا ہے۔ ایسا تجربہ جس میں انسانی معاشرے میں ترسیل و ابلاغ کی ساری شرطیں پوری ہوتی ہیں۔

بقیہ صفحہ 11 پر

خالد احمد، لاہور

کچھ دامن اور باقی باقر نقوی پر

حلقہ بگوشِ وقت، ہنرمند کیوں رہیں
ہم حریت پسند ہیں پابند کیوں رہیں

صورت جدا، مزاج جدا، عادتیں جدا
پھر ہم کسی نظام کے پابند کیوں رہیں

سرزد ہوئے ہیں کون سے ایسے بڑے گناہ
ہر فعل ناسزا پہ رضا مند کیوں رہیں

وا کر دیئے گئے ہیں نہاں خانہ ہائے دل
آنکھیں کھلی ہوئی ہوں تو در بند کیوں رہیں

ناوقت خامشی بھی ہے کتنا بڑا گناہ
گویائی ہے زباں میں تو منھ بند کیوں رہیں

باقر نقوی کا مجموعہ کلام ''تازہ ہوا'' پڑھتے ہوئے مجھے یہ غزل اس کتاب کا دیباچہ لگی اور میرے لیے ۱۹۸۸ء میں ان کے حلقہ ارباب میں شامل ہونے کا دروازہ بنی۔ مجھے باقر نقوی کی سوہنی، من موہنی شخصیت نے تو اپنا اسیر کیا ہی تھا، ان کی شاعری نے بھی اپنی بانہیں میری طرف بڑھا دیں اور مجھے ایک اچھے قاری کی طرح سینے سے لگا لیا۔

ایک یوسف زئی پٹھان ہونے کے ناتے، ہر سید زادہ میری نسلی عقیدتوں کا مرکز ومحور ہو جانا لازم ہے۔ باقر نقوی سے محبت بھری عقیدت ایک مایہ ناز ورثے کے طور پر میرے خون میں لہریں لے رہی تھی، مگر انہیں دیکھتے ہی یہ اچھل پڑی اور ان سے کلام کرتے ہی ابل پڑی۔ میں چند لمحوں کے اندر اندر ان کے اتنے قریب آ گیا، جتنا قریب میں کبھی اپنے قریب بھی نہیں ہو سکا۔ میری عمر تو اپنے آپ سے کتراتے بیت گئی۔ باقر نقوی کی قربتوں کے دوران میں اپنے آپ سے دوری بھی بھلا بیٹھا۔ بلاشبہ باقر نقوی اپنے شاندار حسب اور نسب کے شایانِ شان انسان ہیں۔

کتنے پُراسرار ہیں اس شہر کے شور و سکوت
کس جزیرے پہ اٹھا لائی ہے طغیانی مجھے

سوچ سے معمور آنکھیں تہ بہ تہ ماتھے پہ بل
لگ گئی ہے ساری دنیا کی پریشانی مجھے

کلاہِ کذب و قبائے ریا سے بہتر ہے
کہ آدمی کے بدن پر کوئی لباس نہ ہو

عجیب چال چلے، اب کی بار، بردہ فروش
غریب بک بھی گئے اور دام بھی نہ ملے

کم زور تھے ضرور مگر آبرو تو تھی
رسوا ہمیں بہت، تری امداد نے کیا

رکھتا تھا کبھی خوفِ ستم، بند گھروں میں
اب کے تو ہم انصاف کے ڈر سے نہیں نکلے

خلق اک عرصہ معلوم سے پیاسی ہے تو پھر
بہتے پانی کی یہ آواز کہاں سے آئی

لیکن جناب باقر نقوی کے فکر وفن کے باب میں لب کشائی نہ تو میرا منصب ہے اور نہ ہی میرے لیے مناسب، کیونکہ شعر سے میری وابستگی صرف دلی وابستگی کا درجہ رکھتی ہے۔ نہ زبان و بیان کے بارے میں کچھ کہنے کا یارا ہے نہ اسالیب و مکاتیب فکر وفن سے آشنائی کا اجارا ہے۔ ہاں گنگنا لیتا ہوں، سو، زیادہ سے زیادہ نغمہ گری کی تہمت ہے کہ سر لے سکتا ہوں۔

اگر مجھے باقر نقوی کے 'دامن' میں جگمگاتی، جھلملاتی غزلوں کے بارے میں کچھ کہنا ضروری ہو جائے تو میں صرف اتنا کہوں گا کہ ایسے سخن تو صرف دردمندوں کے دلوں سے ابھرتے، ہونٹوں کا سفر کرتے اور فقط دردمندوں کے کانوں سے دلوں کے دروں خانوں میں اُترتے اور مہکتے ہیں۔ یہ کارِ غم اتنی خاموشی سے ہوتا ہے کہ لوگوں کو کانوں کان خبر نہیں ہوتی۔

مثلاً اگر یہ تحریر کسی دردِ نا آشنا تک پہنچ گئی اور اسے پہلی بار معلوم ہوا کہ مجھے باقر نقوی کی بارگاہ خاص تک رسائی حاصل ہے اور میں ان کے دستِ دعا کی ایک گہری اور سنہری لکیر ہوں تو وہ اس کی تصدیق کے لیے سوچ کر رابطے کرے گا اور کوئی جواب نہ پا کر دیر تک سوچتا رہے گا کہ لندن اور لاہور میں اپنی اپنی تنہائیوں میں مگن یہ دو افراد ایک دوسرے سے کب اور کہاں متعارف ہوئے؟ وہ کیا جانے؟ کہ درد کے رشتے، خون کے رشتوں سے زیادہ مضبوط ہوتے ہیں۔ خاص طور پر اگر یہ جینٹکس کا حصہ بن گئے ہوں۔

باقر نقوی ایک منتخب شخص اور شاعر کے طور پر میرے سینے میں محفوظ ہیں۔ کاش میرا سینہ کھل سکتا اور میں دیکھ سکتا اور لب گویائی، میری بینائی کا ہاتھ تھام سکتا تو میں بتا بھی سکتا اور دکھا بھی سکتا کہ وہ کیسے ہیں؟

اگر میں باقر نقوی کے شعری پیکر پر بات کروں تو بات بن سکتی ہے کہ نغمہ گری، شعری پیکر تراشی کا ایک اور روپ ہے کیونکہ یہ روپ کسی بڑے دکھ کا سروپ ہوتا ہے۔ میں ان لوگوں میں سے ہوں جنہیں کسی کی للک لگ جائے اور اسے جاننا لازم ٹھہر جائے تو وہ اسے چھوڑ کر اس کا دکھ پہچاننے میں لگ جاتے ہیں۔ دکھ انسان کی پہچان ہوتے ہیں۔ چھوٹے دکھ، چھوٹے چھوٹے انسان پیدا کرتے ہیں، بڑے دکھ، بڑے بڑے انسان جنم دیتے ہیں۔ بعض اوقات چھوٹے چھوٹے دکھ مل جل کر، آپس میں گھل مل کر اور پگھل کر یک جائی اور یک جانی کی منزل چھو کر ایک نئی دانائی میں ڈھل جاتے ہیں

کوئی پوچھے کبھی گھر کا، تو انہیں گھر کہہ لیں اور ہم ان در و دیوار سے کیا مانگتے ہیں
یہ کیا کہ اک اڑان ہی میں کٹ گئیں مسافتیں عطا کیے ہیں بال و پر، تو ہم کو آسماں بھی دے
ہاں کہتے کہتے گنگ نہ ہو جائے دل کہیں یا رب! مری زباں کو تابِ سوال دے

تازہ ہوا، مٹھی بھر تارے اور موتی موتی رنگ، بکھراتے باقر نقوی 'بہتے پانی کی آواز' ٹھہرے تو مجھے یوں لگا کہ 'نیا' اور 'گرا' چلتے چلتے اپنے اپنے راستوں کے دکھ سمیٹتے 'نیا گرا آبشاریں' بن کر، مل جل کر، آپس میں گھل مل کر اور پگھل کر ایک نئی دانائی کے دریا میں ڈھلتے آگے چل پڑے ہوں، آگے جہاں گہرا نیلا سمندر اس کا رستہ دیکھ رہا ہو۔ وہ جاودانی آسمانی سمندر جہاں دنیا بھر کے تمام بڑے بڑے شاعر بیک وقت زندہ ہیں اور ہم ان کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے چلتے پھرتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ وہ تو گزر گئے وہ ہم میں نہیں۔ ہم انہیں گنگناتے ہیں اور نہیں جانتے کہ وہ سن رہے ہیں اور ہم پر مسکرا رہے ہیں۔ ہوسکتا ہے کسی دردِ نا آشنا کے لیے میرا، یہ احساس کوئی بلند آہنگ بیان ہو۔ لہٰذا اس کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ احساس، احساس ہوتا ہے، بیان نہیں کیونکہ بیان بدلا جا سکتا ہے مگر احساس سے پیچھا چھڑانے کی کوشش کی جائے تو انسان بکھرا جاتا ہے اور آدمی بیان داغنے لگتا ہے۔ میں یہ احساس پیدا ہونے کا ایک شماریاتی ادراک بھی رکھتا ہوں اور وہ یہ کہ پہلے میں باقر نقوی کا ایک آدھ شعر گنگناتا اور گنگناتا ہی چلا جاتا مگر دوسرا شعر نہ یاد آتا نہ میں یاد کرنے کی سوچتا لیکن اب مجھے ان کی غزلوں کی غزلیں اچھی لگتی ہیں اور میں انہیں بار بار پڑھتا ہوں مگر انہیں گنگنا نہیں پاتا کیونکہ میں اپنے شعر بھی نہیں گنگنا پاتا کہ ایک شعر یاد آئے تو اس شعر کے ساتھ کے شعروں کی فکر میں کھویا رہ جاتا ہوں۔ حافظہ جواب دے گیا ہے، البتہ یہ بات مجھے یاد ہے کہ باقر نقوی کے ہاتھ وہ جادو آ گیا ہے جسے سحر حلال کہہ کر پکارا گیا ہے۔

کہتی ہے زندگی کی رو میرے لیے دعا کرو ایک نہیں مرض ہیں سو، میرے لیے دعا کرو
ہم نے سنا ہے شمع کو کہتے ہوئے پتنگ سے ٹکڑوں میں بٹ رہی ہے لو میرے لیے دعا کرو،
میری رگوں کا جزر و مد میرا نفس ہے چاندنی چاند کی گھٹ رہی ہے ضو، میرے لیے دعا کرو
درد کا دیو بے اماں، قلب نزار و ناتواں ایک پہاڑ ایک جو، میرے لیے دعا کرو

مبارک ہو باقر نقوی، آپ نے وہ جادو پا لیا اب اس مبارک ساعت کا دورانیہ گرفت میں رکھنا اور ہم پر نئے سے نئے اشعار کی برکھا برساتے رہنا مت بھولیئے گا۔ آپ مہک کی چہک ہیں، مہکتے رہیں، ہم سن رہے ہیں، ہم گنگنا رہے ہیں!

زمزمہ حیات چھیڑ! تارِ سراب کچھ تو بول! کب سے ہے منتظر بہار، میرے گلاب کچھ تو بول

ڈاکٹر پیرزادہ قاسم

سائنس اور کائنات

کرہ ارض کے ٹھوس شکل میں موجودگی کا تخمینہ کوئی ۴.۵ بلین سال کا ہے۔آپ چاہیں تو اسے زمانہ قبل از حیات (Pre Biological) عرصہ بھی کہہ سکتے ہیں۔زندگی کے آثار پیدا ہونے سے بہت پہلے تقریباً ایک بلین سال کی مدت کا زمانہ بھی ہے جو بھرپور اور نہایت اہم کیمیائی تعملات پر مشتمل دور جانا جاتا ہے، جب یک سالمی نامیاتی حیات (Bio Monomers) سے کثیر سالمی نامیاتی حیات (Bio Polymers) ہے اور پھر ان میں خود ترتیبی (Self Assembly) کا عمل شروع ہوا جس کی انتہا بنیادی خلیہ (Proto Cell) سے لے کر زندگی سے پر فعال خلیے (Living Cell) پر ہوئی۔اس طرح کہا جاسکتا ہے کہ پہلا خلیہ کوئی ۳.۵ بلین سال پرانا ہوسکتا ہے جبکہ قدیم ترین فوسل (3.2 بلین سال پرانا) کی نشاندہی کی جاچکی ہے۔یک خلوی (Single cell) حیات سے کثیر خلوی حیات (Multi Cellular) اور پھر انسان تک ارتقا کی ایک شاندار اور دلکش کہانی ہے۔ان تمام تفصیلات سے صرف نظر کرتے ہوئے آج ہم نہایت سادگی سے خلیے کو زندگی کی اکائی کہتے ہیں اور اسی میں حیات کے جملہ راز اور تمام مظاہر نہاں اور عیاں ہیں۔حیات انسانی کا بلیو پرنٹ (Blueprint) جس کی جانب ماہر حیاتیات جیمس واٹسن نے ۱۹۵۳ء میں مرکزی ترشے (DNA) کی بناوٹ اور ساخت کو بیان کرتے ہوئے اشارہ کیا، اب جون ۲۰۰۰ء میں طویل جدوجہد کے بعد صرف ایک سادہ ڈرافٹ کی شکل میں پیش کیا جاسکا ہے اور سپر کمپیوٹر کی مدد سے سائنس داں انسانی جینوم کا مطالعہ اور زندگی کی تشکیل اور بقا کے مسائل کو سمجھنے اور حل کرنے کی کوششیں کررہے ہیں۔انسانی خلیے میں موجود جینز (Genes) کی تعداد ایک اندازے کے مطابق اڑتیس ہزار سے ایک لاکھ بیس ہزار کے درمیان ہے۔جب تمام جینز دریافت ہوجائیں گی تب شاید حیات انسانی کا بلیو پرنٹ ایک مربوط اور مکمل نقشے کی شکل میں سامنے آسکے گا۔اس وقت شاید ہم بہتر طور پر انسانی فلاح اور حیات کی حرمت کا مفہوم سمجھ سکیں گے۔

اس موضوع یا قریب کے موضوعات پر دنیا کی بہت سی زبانوں میں بالخصوص انگریزی میں بہت سی کتابیں پیشہ ورانہ بھی اور عام فہم بھی، دستیاب ہیں اور بڑی تعداد میں ہیں لیکن اردو میں سائنس کے موضوعات پر کتابیں نہ ہونے کے برابر ہیں۔اس بات کی ضرورت محسوس کی جاتی رہی ہے کہ خالص سائنسی انداز سے ہٹ کر عام فہم اور دلچسپ انداز میں حیات انسانی کی اکائی یعنی خلیے کی ساخت، کارکردگی اور امکانات پر اردو میں بھی کوئی بنیادی اور تازہ ترین معلومات پر مشتمل کتاب ہو۔یہ کام حیاتیاتی سائنس دانوں کے کرنے کا تھا مگر اس سلسلے میں جناب باقر نقوی نے پیش رفت کی۔باقر نقوی ذہن رسا رکھتے ہیں۔تخلیقی سوچ کے جوہر سے فیض یاب ہیں۔شعر بھی کہتے ہیں اور نثر بھی رواں اور پختہ کار ہیں۔دلچسپ اور افادیت کے حامل موضوعات کی تلاش ان کا خاصہ رہی ہے۔پیش نظر کتاب جس کا عنوان باقر نقوی نے خلیئے کی دنیا (جینیات کے موضوعات) رکھا ہے، اپنے پر کشش، دلچسپ اور معلومات افزا طرز اظہار کے سبب اردو میں ایک نہایت اہم اور منفرد کوشش قرار دی جاسکتی ہے۔یہ جدید معلومات پر مشتمل باتصویر کتاب ہے جو عام قارئین کے لیے بے حد مفید ثابت ہوگی۔سادہ زندہ خلیئے سے لے کر انسانی کلوننگ اور جین کاری جیسے تمام اہم موضوعات پر تازہ معلومات یکجا کردی گئی ہیں۔باقر نقوی اپنی اس پیش کش پر بجا طور پر قابل ستائش اور مبارکباد کے حقدار ہیں۔

کتاب کی ابتدا جس مقدمے سے ہوئی ہے اسے باقر نقوی نے ''حمد'' کا عنوان دیا ہے جو اپنی معنویت میں منفرد ہوگیا اور میں خصوصی طور پر اسے پسندیدگی کی نظر سے دیکھتا ہوں۔خدا، کائنات، حیات اور اس کی تشریح وابلاغ کے لیے اب تک بہت کچھ لکھا جاچکا ہے۔مذہبی اسکالرز، فلاسفہ، شعرا، صوفیا اور سائنس دانوں نے اپنے اپنے منصب ومسلک کے تحت اس موضوع کو بیان کیا ہے اور اس کی غایت پر روشنی ڈالی ہے۔یہ تمام کاوشیں درحقیقت خدا یا اسی حقیقت اولیٰ کے پالینے اور سمجھ لینے کے لیے ہیں۔صدیوں کے اس فکری اور تشریحی سفر میں مذہبی اور روحانی اسکالرز تو خدا سے قریب ترین رہے لیکن فلاسفہ اور شعراء اپنی علمی موشگافیوں میں کبھی بہت قریب اور کبھی بہت دور نظر آئے۔البتہ سائنس دانوں کی نمایاں مذہبی سوچ تسلسل کے ساتھ یہی رہی کہ

بقیہ صفحہ 20 پر

سیّد مظہر جمیل

''دامن'' پر ایک نظر

''دامن'' باقر نقوی کے چار شعری مجموعوں پر مشتمل کلیات ہے جسے اکادمی بازیافت (کراچی) کے زیرِ اہتمام شائع کیا گیا ہے۔ اس کلیات میں باقر نقوی نے جن شعری مجموعوں کو یک جا کیا ہے ان کے نام ہیں: (۱) تازہ ہوا (۱۹۸۸ء)، (۲) مٹھی بھر تارے (۱۹۹۱ء)، (۳) موتی موتی رنگ (۱۹۹۷ء) اور تازہ کلام'' بہتے پانی کی آواز'' کے عنوان سے مرتب کیا گیا ہے۔ ان مجموعہ ہائے کلام کی یک جائی نے باقر نقوی کے چالیس سال پر محیط تخلیقی سفر کے منظرنامے کو روشن کر دیا ہے اور اب ہم بآسانی ان تبدیلیوں کی نشان دہی کر سکتے ہیں جو باقر نقوی کے شعری اظہار میں بتدریج وقوع پذیر ہوتی رہی ہیں۔ گویا ''دامن'' کی اشاعت نے باقر نقوی کے شعری افق پر پھیلی دھنک کے رنگوں کو زیادہ واضح اور روشن بنا دیا ہے۔

باقر نقوی کا پہلا شعری مجموعہ ''تازہ ہوا'' جب سولہ برس قبل ۱۹۸۸ء میں شائع ہوا تھا تو دنیا بھر میں پھیلے ہوئے اردو کے ادبی حلقوں نے بالعموم اور پاک و ہند کے ادبی حلقوں نے بالخصوص اس کی اشاعت کو دیارِ مغرب سے آنے والی تازہ ہوا کے جھونکے سے تعبیر کیا تھا اور باقر نقوی کے شعری تلازموں میں رواں عصری حسیت کی جھلکیاں دیکھ کر اردو شاعری کے افق پر ایک نئے ستارے کے طلوع ہونے کی شہادت پائی تھی۔ خوش آئند بات یہ ہے کہ باقر نقوی نے اپنی شاعری کے طویل سفر میں ادبی حلقوں کی قائم کی ہوئی توقعات کا گراف نہ صرف مستقل مزاجی سے قائم رکھا ہے بلکہ ایجاد و اختراع اور فکر و خیال کے نئے اور وسیع تر امکانات کی نوید بھی سنائی ہے۔

''دامن'' کے مندرجات پر ایک سرسری نظر ڈالیے تو یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ باقر نقوی بالعموم غزل کو شعری اظہار کا وسیلہ بناتے ہیں۔ انھوں نے نظمیں کم کم ہی لکھی ہیں لیکن اگر نظم نام ہے خیال کی اکائی پر مشتمل صنفِ سخن کا تو اس کمی کو باقر نقوی نے اپنی غزلِ مسلسل سے پورا کر دیا ہے۔ جس دور اور جس ماحول میں انھوں نے غزل سرائی شروع کی تھی، اس میں روایتی قافیہ پیمائی کے سہارے مشاعرے تو لوٹے جا سکتے تھے، لیکن سنجیدہ صاحبانِ ذوق کو تا دیر اپنی جانب اس وقت تک متوجہ نہیں کیا جا سکتا تھا، جب تک آپ کی غزل فکر و احساس کی غیر معمولی تازگی اور لفظ و معنی کی منفرد تابندگی کی حامل نہ ہو کہ ستر کی دہائی تک اردو کی جدید غزل ایجاد و اختراع کے کئی موڑ کاٹ چکی تھی اور جدید غزل کی جمالیات یک گونہ بدلے ہوئے مزاج اور موسموں سے عبارت ہونے لگی تھی، ایک طرف کلاسیکل استعاراتی نظام اور روایتی صنعت گری کی بھول بھلیاں تھیں جس کی گرفت سے جدید غزل نے خود کو آزاد کرانے کی تگ و دو شروع کر رکھی تھی تو دوسری طرف ضمیرِ عالم پر فکر و احساس اور جذبہ و خیال کی ایسی نئی آگہی دستک دے رہی تھی جس سے کوئی حساس اور خلاق فن کار صرفِ نگاہ کر ہی نہیں سکتا تھا۔ چنانچہ ہمہ رنگ زندگی کے تیزی سے تبدیل ہوتے ہوئے مناظر اور غم و نشاط کے متنوع رنگوں کی شفق جدید غزل میں بھی جھلکنے لگی تھی۔ پچاس سال سے بھی کم مدت میں لڑی جانے والی دو عالمی جنگوں کی ہولناکیوں نے انسان کے گرد پھیلے کائناتی نظام کو شکست و ریخت سے دوچار کر دیا تھا۔ سائنسی حقائق کی دریافت اور ٹیکنالوجی کا وفور جہاں نئے امکانات کی نشان دہی کر رہا تھا، وہیں انسان کی بے چارگی اور بے بضاعتی کا ثبوت بھی فراہم کر رہا تھا۔ چنانچہ اس دور میں دنیا بھر کی زبانوں میں لکھا جانے والا ادب ایک نئے ذائقے، نئے آہنگ اور نئے امکانات کا حامل رہا ہے۔ اردو غزل میں بھی نئے موضوعات، نئے استعارے، نئی لفظیات اور نئی گلاسری کا عمل دخل شروع ہو چکا تھا۔ یہاں تک کہ غزل کی قدیم لفظیات و رسمیات بھی جدید تر معنی و مفہوم پانے لگی تھیں۔ چنانچہ باقر نقوی کو ابتدا ہی سے قدرے مشکل سوالات کا سامنا تھا کہ انھوں نے غزل کے نام پر روایتی قافیہ پیمائی کے بجائے زندگی کی تگ و تاز کو جذبہ و احساس کی سطح پر تخلیقی پیکر دینے کا فیصلہ کیا تھا جو یقیناً ایک کٹھن اور جان لیوا کام تھا۔ بے شک اردو غزل ایک ایسی زرخیز، نمو زائیدہ، متنوع اور دیالو صنفِ سخن ہے جو ایک اوسط درجے کے ریاضیاتی شاعر کی جھولی میں بھی دو چار چمکتے ہوئے شعر اور دس بیس دمکتے ہوئے مصرعے ڈال ہی دیا کرتی ہے جن کے سہارے شہرتِ عام کے متوالے خوش وقتی کی سوغات سمیٹتے ہوئے نہیں تھکتے، لیکن ایک تازہ جو، تخلیقی فن کار شرار جستہ کی طرح لحاتی چمک دکھا کر خاکستر ہو جانے کے بجائے افقِ شعر پر اپنے نام کے جھلملاتے ستارے کو تلاش کرنے کی تگ و دو ہی میں مصروف ہو جانے کو ترجیح دیتا ہے۔ باقر نقوی کا شمار ایسے

ہی تازہ جو فن کاروں میں کیا جانا چاہیے جو چمکتی دمکتی شہرت سے گریزاں نسبتاً طویل راستے کو اختیار کرتے ہیں جس پر چل کر انسان بالآخر اپنی ذات ہی نہیں بلکہ اپنی کائنات کی سرحدیں بھی تلاش کر لیتا ہے:

نام سے میرے کبھی مجھ کو پکارا جائے — میں جدھر جاؤں اُدھر میرا ستارا جائے
کشتیاں ڈوب چکیں ریت کے دریاؤں میں — اب تو سیلاب کے ہمراہ کنارا جائے
ہے بپا پھر وہی جشنِ مہِ نخشب باقرؔ — ایک جگنو ہے کہیں وہ بھی نہ مارا جائے (تازہ ہوا)

''تازہ ہوا'' سے لے کر ''بہتے پانی کی آواز'' تک موضوعاتی اور اسلوبیاتی تنوع کا آہنگ اور تازہ کاری کے جوہر نمایاں نظر آتے ہیں۔ ان کی غزل نہ تو روایتی مضامین کی جگالی ہے اور نہ محض قافیہ و ردیف کی وظیفہ جوئی سے عبارت ہے۔ دیارِ مغرب میں مستقل بود و باش عام طور پر ایک تہذیبی مغائرت اور ناسٹلجیائی کیفیت کو جنم دیتی ہے اور وہاں سے آنے والے اکثر شعری آہنگ میں ایک گونہ حزن اور یاس کا احساس ہوتا ہے جو غزل کے لب و لہجے میں گھل کر عجب کرشمے دکھاتا ہے۔ ایسے شعری رویے دراصل اپنے ہی پیدا کردہ رومانی غبار میں گم ہو کر رہ جاتے ہیں اور عصری حسیت اور انفرادی جذبہ و ادراک کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالنے کا حوصلہ نہیں رکھتے۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ باقر نقوی کی ابتدائی دور کی شاعری میں بھی ''بے گھری'' کا احساس کسی قسم کی ناسٹلجیائی خودترحمی کا شکار نہیں ہوتا، بلکہ وہ اسے اردگرد تیرتی ہوئی حقیقت سے منسلک کر کے عالمی تناظر میں دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ گھر میں پھیلے سناٹے کے جادو کو باہر گلی میں سنسناتی تیز ہوا کے پس منظر میں سننے کا حوصلہ رکھتے ہیں:

کس کو چاہوں، کس سے بولوں، خول سے کیسے نکلوں — گھر کے اندر چپ کا جادو، باہر تیز ہوا ہے
اجنبی ہے سرزمیں تو تو اجنبی نہ رہ — کوئی نقش اتار دے، کوئی استعارہ لے
کیا کریں واپس وطن جا کر جہاں گھر ہے نہ در — اب مرے اجداد کے مدفن بھی ٹیلے ہوگئے
کوئی پوچھے جو کبھی گھر، تو اسے گھر کہہ لیں — اور ہم ان در و دیوار سے کیا مانگتے ہیں
بے گھری میں تو بس اِک غم تھا کہ بے گھر ہیں ہم — کتنے آزار لگا دیتا ہے اِک گھر ہونا
باقرؔ وہی جھونکا ہے مجھے جان سے پیارا — جو آ کے بدل دیتا ہے نقشہ میرے گھر کا

یہ بات تو سب ہی جانتے ہیں کہ جدید غزل پرانی شراب کو نئی بوتلوں میں بھرنے کا نام نہیں ہے، یعنی روایتی مضامین کو محض نئے لفظی پیکر پہنانے سے نئی غزل وجود میں نہیں آتی، بلکہ جدید غزل نام ہے خیال اور احساس کے نئے امکانات کی دریافت کا، جن سے معاصرانہ زندگی کے صبح و شام روشن ہوتے ہیں۔ کلاسیکل روایت جدید غزل کے پاؤں کی زنجیر بننے کے بجائے اس کی رواں موجوں کو نئے معنیاتی مد و جزر عطا کرتی ہے۔ باقر نقوی کی غزل کی اوّلین انفرادیت موضوعات کا وہ تنوع ہے جس کی اب سے پہلے غزل کی قلمرو میں سمائی ناممکن نہیں تو مشکل ضرور تھی۔ ترقی پسندوں نے نئی غزل کو سماجی وسیاسی وجدلیاتی استعارہ ضرور دیا تھا لیکن انسان کے ذاتی و صفاتی کرب اور زندگی کی سفاک سچائیوں کو تخلیقی اردو غزل میں سمونے کا کام اسی عہد میں ہوا ہے جس میں باقر نقوی نے اپنے سفر کا آغاز کیا تھا:

دوا بغیر کوئی طفل مر گیا تو کیا ہوا — بس ایک پھول ہی تو تھا بکھر گیا تو کیا ہوا
پہنچ گئے ہیں صنم نور کے جہانوں میں — زمیں کی جنگ چھڑے گی اب آسمانوں میں
افق پہ جھومیں گے ہر وقت ایٹمی بادل — چمن میں راکھ تو آسیب آستانوں میں
اُگے نہ موت زمیں پر تو اور کیا ہوگا — کہ بیج زہر کے بانٹے گئے کسانوں میں
دودھ کی نہریں سوکھ گئی ہیں، پتھر ہے مخلوق — جنگل میں نیزے اُگتے ہیں ندیوں میں تیزاب
ہم نے خود دیکھا کہ چڑیوں نے بھی تنکوں کے عوض — دھات کے ٹکڑے چنے ہیں آستانوں کے لیے
بن گئیں شوقِ سفر میں اتنی بھاری کشتیاں — زورِ طوفاں چاہیے اب بادبانوں کے لیے

ہوائیں خود دھماکا خیز اتنی ہیں کہ اب تو ہواؤں کو چراغوں سے بچانا پڑ رہا ہے

''دامن'' کا مطالعہ صرف موضوعاتی اعتبار سے وسیع تر تناظر کا احساس نہیں بخشتا بلکہ اسلوبیاتی سطح پر بھی جمالیاتی حظ اور تسکین فراہم کرتا ہے۔ ایک ایسے دور میں جب شعری زبان، استعارتی نظم اور رسمیات تک شکست و ریخت سے دوچار ہو رہے ہوں، وہاں غزل کی کلاسیکل پابندیوں کو بے جا زک پہنچائے بغیر زبان و بیاں کے نئے امکانات کی تلاش یقیناً تخلیقی سطح پر تازہ کاری کا ثبوت فراہم کرتی ہے۔ خاص طور پر نام نہاد لسانی تشکیلات کے دور میں ہم جانتے ہیں کہ تخلیقی زبان اور اسلوب کا رشتہ فکر و خیال کے دامن سے بندھا ہوتا ہے۔ چنانچہ ایک منجمد خیال اور ٹھٹھری ہوئی فکر رواں اور متحرک زبان و اسلوب کو جنم نہیں دے سکتے۔ باقر نقوی زندہ اور متحرک شعری منظرنامے کی تشکیل کے لیے جن خطوط اور رنگوں کو استعمال کرتے ہیں وہ بجائے خود زندگی آمیز اور حیات افروز ہیں۔ دھڑکتے ہوئے جذبے اور تڑپتے ہوئے احساس کو ایسے ہی لسانی پیکر کی ضرورت ہوا کرتی ہے۔ ''تازہ ہوا'' سے لے کر ''بہتے پانی کی آواز'' تک باقر نقوی جن استعاروں کو اپنے تخلیقی اظہار کے لیے بالعموم استعمال کرتے ہیں وہ سب زندگی کے نمائندہ استعارے ہیں جیسے ہوا، پرندہ، دھوپ، پھول، دریا، صحرا، شہر، بازار، آگ، ستارہ، بچہ، سمندر، سیلاب، کونپل، طغیانی، اجالا، قفس، کشتیاں، بادبان، بادل، نہر، کوفہ اور بغداد۔ ان استعاروں کا اظہار اور ابلاغ ایسے ہی زندہ اور متحرک زبان اور اسلوب میں ممکن تھا۔ ان کے ہاں غیر ضروری سخن طرازی کی اذعایت بھی دکھائی نہیں دیتی جس کی کارفرمائی اکثر ان کے ہم عصروں کے ہاں نظر آتی ہے۔ اس رویے ہی نے انھیں غیر مانوس فضا سازی اور چونکا دینے والی لفظیات کے گورکھ دھندے سے بچا لیا ہے اور وہ ایک صاف ستھرا اور مؤثر اسلوب تراشنے میں کامیاب رہے ہیں اور ان کی یہ کامیابی جدید شعری لحن کی کامیابی اور معنی خیزی کا بھی بین ثبوت ہے۔ باقر نقوی جیسے شاعر اپنے عہد کو ثروت مند بناتے ہیں۔

☆☆☆

بقیہ: سائنس اور کائنات صفحہ : 17

سائنس بلا شرکت غیر یہ صلاحیت رکھتی ہے کہ وہ کائنات اور انسان دونوں کی تخلیق و تشکیل کو فیصلہ کن طور پر بیان کر سکے۔ اسے خدا، مذہب یا روحانیت کی ضرورت نہیں۔ مگر دلچسپ امر یہ ہے کہ اب صورت حال بدل رہی ہے اور اب دنیا کے کئی اہم سائنس داں یہ کہنے پر مجبور ہیں کہ ان کی تحقیقات انھیں یہ سمجھنے پر مجبور کر رہی ہیں کہ سائنس جواب تک خود کو ہی خدا سمجھے ہوئی تھی دراصل خدا کی جانب سفر یا سمت کا ایک نام یا حوالہ ہے۔ آج دنیا میں مختلف موضوعات پر کام کرنے والے اہم سائنس دانوں کی آراء ہم آواز ہو رہی ہیں اور کہہ رہی ہیں کہ اس کائنات اور انسان کے بارے میں اتفاقیت (**Randomness**) کا نظریہ درست نہیں بلکہ یہ سب کچھ ایک اعلیٰ اور منظم صورت حال یا **Design** کا متقاضی ہے۔ ان سائنس دانوں کے تجربات و نتائج نے نشاندہی کی ہے ایک اعلیٰ اور نمایاں مقصدیت کائنات اور انسان کی تخلیق و تعمیر میں موجود ہے۔ اس موضوع پر بہت سی تحریریں ملتی ہیں تاہم ۱۹۹۴ء میں ترتیب دی ہوئی **Sir J.M Templeton** کی کتاب **Evidence of Purpose** میں اس موضوع کا اچھا احاطہ کیا گیا ہے اور سائنس داں خالق حقیقی کی تلاش میں جن منزلوں سے گزر رہے ہیں گزرے ہیں اس کا اچھا احوال اس کتاب میں مل جاتا ہے۔

آج ایک جانب سائنس اور ٹیکنالوجی اپنی سرحدوں کی تنظیم نو یا تعریف نو (**Redefine**) کر رہی ہے اور غضب کی پیش رفت ہو رہی ہے تو دوسری جانب ہم علم و آگہی سے بیگانگی کا رویہ اپنائے ہوئے ہیں اور حصول دولت کو ہی سب کچھ سمجھ بیٹھے ہیں اور بھلا بیٹھے ہیں کہ علم ہی تو انسان کی میراث ہے۔ پھر بحیثیت مسلمان ہماری عبادات کے بعد بزرگ ترین عبادت حصول علم ہی ہونا چاہیے۔ علم و حکمت سے دوری اور بے اعتنائی نے ہی ہمیں پستی میں دھکیل دیا ہے۔ قومی اور ملی تعمیر نو کے لیے تو ہمیں اپنا رشتہ ہر صورت میں علم و حکمت، تعلیم، سائنس اور ٹیکنالوجی سے ہی جوڑنا پڑے گا۔ اس منزل کی جانب جانے والے راستے سے کوئی مختصر اور آسان بغلی راہ نہیں نکلتی۔ یہ سفر راست مگر دشوار گزار ہے۔ باقر نقوی کی یہ کتاب ''خلیے کی دنیا'' اسی سفر کی جانب ایک اشارہ ہے۔ مثبت، خوبصورت اور بامعنی۔

☆☆☆

امجد اسلام امجد

الفریڈ نوبیل

حیرت کی بات ہے کہ انسان کی تخلیقی صلاحیتوں کے اعتراف میں، بیسویں صدی کے جس ایوارڈ کو سب سے زیادہ عزت اور پزیرائی ملی ہے اس کے بارے میں عام لوگوں کی کیا، خواص کی معلومات بھی بہت کم ہیں۔ گزشتہ چند مہینوں میں میں نے مختلف لوگوں سے الفریڈ نوبیل کے بارے میں بات چھیڑی لیکن کم و بیش سب کے سب کی معلومات کا دائرہ سات آٹھ جملوں تک ہی محدود تھا، یہی کہ اس کا تعلق سویڈن سے تھا، اس نے ڈائنامائٹ ایجاد کیا تھا، اپنی ساری جائیداد کا ایک ٹرسٹ بنا دیا تھا جس سے ہر سال مختلف شعبوں میں اعلیٰ کارکردگی پر نوبیل پرائز دیئے جاتے ہیں جو فی الوقت دنیا میں اعلیٰ ترین اعزاز سمجھا جاتا ہے اور یہ کہ ۱۹۰۱ء سے ہر سال یہ ایوارڈ تقسیم کیے جا رہے ہیں۔ ٹیگور اور ڈاکٹر عبدالسلام کے علاوہ بھی برصغیر سے تعلق رکھنے والے دو تین لوگوں کو یہ انعام مل چکا ہے اور......بس۔

چند برس قبل باقر نقوی صاحب نے جن کا شعبہ اکاؤنٹس اور وجہ شہرت ان کی اردو شاعری ہے، ایک گفتگو کے دوران ذکر کیا کہ وہ آج کل الفریڈ نوبیل کے بارے میں مختلف کتابیں اور معلومات جمع کر رہے ہیں جو انتہائی دلچسپ کام ثابت ہو رہا ہے اور یہ کہ موصوف شاعر بھی تھے ثبوت کے طور پر انھوں نے ایک نظم کی کچھ لائنیں بھی سنائیں جو حال ہی میں ان کے ہاتھ لگی تھی۔

اردو سائنس بورڈ کا چارج لینے کے بعد ایک دن الفریڈ نوبیل کے حوالے سے ایک تحریر سامنے آئی تو خیال آیا کہ کیوں نہ نوبیل کے حالاتِ زندگی اور کمالاتِ فن کو ایک کتابی شکل میں جمع کیا جائے تاکہ قارئین اس سے استفادہ کر کے اس اہم تاریخی شخصیت اور ان کے نام پر جاری، اس عظیم ایوارڈ کے بارے میں جان سکیں جس کا سایہ پوری بیسویں صدی پر پھیلا ہوا ہے۔ فوراً دھیان باقر نقوی صاحب کی طرف منتقل ہوا، انھوں نے بخوشی یہ کتاب لکھنے کی حامی بھر لی۔

باقر نقوی صاحب نے بڑی محنت اور تحقیق سے نہ صرف بڑے دلچسپ انداز اور رواں تحریر میں الفریڈ نوبیل کی داستانِ حیات قلم بند کی ہے بلکہ اس کے ساتھ ساتھ نوبیل پرائز کے آغاز سے لے کر ۱۹۹۷ء کے تمام ایوارڈ یافتگان کے بارے میں بھی بنیادی معلومات یکجا کر دی ہیں اور یوں اب ہم آسانی سے جان سکتے ہیں کہ کس شعبے میں، کس ملک کے، کس آدمی کو، کس سنہ میں، یہ انعام ملا تھا اور یہ کہ اس کے اس انعام یافتہ کام کی نوعیت کیا تھی۔ اس کے ساتھ برصغیر سے تعلق رکھنے والے نوبیل انعام یافتگان کے لیے ایک خصوصی گوشہ مخصوص کیا گیا ہے اور ان کے بارے میں علاحدہ سے تعارفی مضامین لکھے گئے ہیں کہ یہ لوگ تعداد میں بہت کم ہی سہی مگر اس بات کا ثبوت ہیں کہ تیسری دنیا میں بھی جوہرِ قابل کی کمی نہیں اور اگر یہاں تحقیق کا ماحول زیادہ سازگار ہو اور اس کے لیے متعلقہ وسائل اور سہولتوں کا کچھ نہ کچھ بندوبست ہو سکے تو عین ممکن ہے کہ اکیسویں صدی کے انعام یافتگان میں ہمارے آدمیوں کی تعداد بڑھتی چلی جائے۔

یہ کتاب ایک ایسے وقت میں شائع ہو رہی ہے جب پاکستان اللہ کے فضل و کرم سے ایک ایٹمی طاقت بن چکا ہے اور اس بات کے شواہد مل رہے ہیں کہ قومی اور سیاسی سطح پر سائنس کی اہمیت اور ترویج و ترقی کی ضرورت کو پہلے سے بہت زیادہ محسوس کیا جا رہا ہے۔ ہم امید کرتے ہیں کہ یہ کتاب نہ صرف قارئین کے علم و شعور میں اضافہ کرے گی بلکہ بلواسطہ طور پر ہماری زندگیوں میں بھی سائنس اور سائنسی شعور کو فروغ دے گی۔

ساحر شیوی کے حمدیہ اور نعتیہ ماہیوں کا مجموعہ خاکِ مدینہ

سین ریوز کا مجموعہ دیواروں کے کان

دوہوں کا مجموعہ دوھے کوکن کے شائع ہو گئے ہیں

واضح رہے کہ طنز و مزاح کی جاپانی صنفِ سخن سین ریوز کا یہ دوسرا اردو مجموعہ ہے

ڈاکٹر شکیل نوازش رضا

مغرب میں مشرق کا نقیب: باقر نقوی

دور دیسوں میں بسنے والے بہت سے شاعر وادیب اردو شعر وادب کی اپنے خونِ جگر سے آبیاری میں مصروف ومشغول ہیں۔ ریاست ہائے متحدہ امریکا، لاطینی امریکا، انگلستان، جرمنی، فرانس، اٹلی وغیرہ ہوں یا افریقا کے ممالک، سعودی عرب متحدہ امارات کے ممالک ہوں یا جاپان اور آسٹریلیا کے ممالک ہر جگہ اردو شعر و ادب کے دیوانے اس کی خدمت میں سرگرداں نظر آتے ہیں۔ اردو شعر وادب سے وابستہ ان افراد کے مختلف گروہ ہیں۔ کچھ نے روایت سے اپنا رشتہ استوار کر رکھا ہے اور جو کلاسیکی شاعری آج سے پچاس برس پہلے ان کے نظر نواز ہوئی تھی۔ اسے انھوں نے اپنی گرہ میں باندھ لیا ہے۔ وہ کلاسیکی شاعری کے رسیا ہیں اور اسی روایتی شاعری سے اپنا دامن باندھے رکھنا ان کا طرۂ امتیاز ہے۔ شاید وہ یہ سمجھتے نہیں کہ زمانے کے انقلابات اور تبدیلیوں سے اردو شعر وادب اثر قبول نہیں کرتا۔ ایک دوسرا گروہ بالکل ہی متضاد کیفیت کا حامل ہے۔ یہ گروہ اردو شعر وادب کی عکاسی واظہار موجودہ دور کی مغربی اقدار، سماجی زندگی، روایات، افکار ونظریات، تحریکات وثقافت کے ذریعے بڑی شدومد سے کرتا ہے۔ اس نے اپنا رشتہ مشرقی اقدار، تہذیب وثقافت سے قطعی طور پر توڑ لیا ہے۔ اس گروہ کی تخلیقات طبع زاد سے زیادہ ترجمہ معلوم ہوتی ہیں۔ شعر وادب کی تخلیق سے وابستہ ایک تیسرا گروہ بھی ہے۔ اس گروہ کے افراد نے اپنے وطن کی مٹی سے اپنا ناتا نہیں توڑا ہے۔ وہ وطن سے دور ہیں۔ برسوں سے غیر ملکوں میں زندگی گزار رہے ہیں۔ اردو میں شاعری بھی تخلیق کر رہے ہیں۔ مغربی افکار وخیالات سے فائدہ بھی اٹھا رہے ہیں۔ وہ نئے ادبی تحریکات سے بھی ناآشنا نہیں، مگر وہ اپنے وطن کی تہذیب وثقافت، اقدار وافکار کو فراموش نہیں کرتے۔ انھوں نے اپنے ذہن وقلب میں ایک ایسی کھڑکی کھول رکھی ہے جو انھیں مغربی افکار وخیالات کی ہوا سے تازگی بخشتی رہتی ہے تو دوسری طرف اپنے وطن کی مٹی کی خوشبو انھیں اپنے دیس کی روایات، اقدار وافکار کو فراموش نہیں کرنے دیتی ہے۔ باقر نقوی کا تعلق شعرا کے اسی گروہ سے ہے۔

جدید دور میں جدیدیت سے متاثر ہوئے بغیر اردو غزل کو نئے رنگ وآہنگ سے آشنا کرنے والوں میں باقر نقوی کا نام سرفہرست ہے۔ انھوں نے اپنے اشعار میں جو علامتیں استعمال کی ہیں وہ جدید ضرور ہیں لیکن قاری کو ان کی ترسیل میں دقت نہیں ہوتی۔ ان کی **images** میں تازہ کاری ہے۔ ان کی غزلوں میں رمزیت اور اشاریت تو ہے لیکن اس میں قدامت اور بے رونقی دور دور تک نہیں ہے۔ ان کا انداز دھیما پن لیے ہوئے ہے۔ ان کی شاعری تیز لو نہیں دیتی۔ وہ دھیرے دھیرے سلگتی ہے اور اچانک آتشِ شوق کو بھڑکا دیتی ہے۔ باقر نقوی الفاظ کے بازی گر نہیں ہیں۔ ان کے الفاظ سادہ، مگر معنویت سے بھرپور ہیں۔ ان کی شاعری کی یہ خصوصیات ہی انھیں اپنے ہم عصروں سے ممتاز اور متمیز کرتی ہیں۔

راقم الحروف ابتدا ہی میں اس حقیقت کا اعتراف کر لینا چاہتا ہے کہ باقر نقوی کی شاعری پر یہ مختصر سا تبصرہ ان کے نئے شعری مجموعے ''موتی موتی رنگ'' کی بنیاد پر مبنی ہے۔ اس شعری مجموعے سے پہلے باقر نقوی کے دو شعری مجموعے اور شائع ہو کر عوام وخواص کو متاثر کر چکے ہیں۔

''موتی موتی رنگ'' کا مطالعہ کرنے والا پہلا تاثر یہ قائم کرتا ہے کہ اس مجموعے کے شاعر کی شاعری ارتقا پذیر ہے اور وہ خوب سے خوب تر کی تلاش میں سرگرداں ہے۔ اس کا شعری شعور متحرک ہے جامد نہیں۔ اس نے ذہن وقلب کے دروازے وا رکھے ہیں کہ قلب اور نئی وارداتوں سے آشنا ہو سکے اور ذہن کے دریچے اور روشن ہو سکیں۔

باقر نقوی کو اپنے وطن کی مٹی سے از حد پیار ہے۔ ایک زمانے سے سات سمندر پار رہائش پذیر ہونے کے باوجود انھیں وطن کی مٹی کی خوشبو ستاتی رہتی ہے۔ اس طرح دور دیس میں ایک طویل عرصے سے قیام کرنے کے باوجود انھوں نے اپنے وطن کی مٹی سے اپنا رشتہ استوار کر رکھا ہے:

میری مٹی سچی مٹی، سچی مٹی سونا — باقی سب کچھ کنکر پتھر یا پھر جادو ٹونا
سات سمندر پار سے کس کے جسم کی گرمی آئے — کس خوشبو سے مہکے خالی گھر کا کونا کونا

پار سمندر کرنا بھی واپس بھی آنا ہے — ایسی ہوا میں مت اڑنا جو پر کمزور کرے
کرو کچھ اور قیامت کا انتظار ابھی — مری زمین کا اجڑا نہیں سنگھار ابھی
یارو کوئی جتن کرو کہ جو پیارے بیٹوں کو — پلٹائے پردیس سے سونی مانگوں میں رنگ بھرے
مٹی تو مری ہے پرایا گی، پر دھوپ لگی ہے مہرانی — گنگا میا میری آنکھوں میں اور سندھ کا دھارا دل میں ہے
میں اسی زمین کا پوت ہوں تو یہ غیریت کا سلوک کیوں — میں کہیں خلا میں اگا نہیں، کسی آسماں سے گرا نہیں

ان اشعار کے خالق کی فکر میرے خیال کا اعتراف کرتی ہے اور اس کی غماز ہے کہ سات سمندر پار رہتے ہوئے بھی شاعر اپنے وطن میں موجود ہے۔ اپنی زمین پر پھیلے ہوئے مسائل کا احساس اور اپنی زمین سے محبت کے جذبات دل میں کروٹیں لیتے رہتے ہیں اس لیے باقر نقوی ہجرت کے کرب سے آگاہ نہیں ہیں نہ اس کا ذکر شدت سے اپنی شاعری میں کرتے نظر آتے ہیں۔ اگر کبھی ان کو احساس ہوتا ہے تو وہ یہ ضرور کہتے ہیں کہ:

اس مٹی سے اس مٹی اور اس کے بعد سمندر — ساری عمر بسر کیا یونہی ہجرت ہجرت ہوگی

مگر کیونکہ وہ ہمیشہ اپنے وطن کی مٹی کی خوشبو سے اپنے من کی دنیا کو بسائے رکھتے ہیں، اسی لیے ہجرت کی گردان کے قلب کو دھول نہیں کرتی۔

وطن سے محبت کا اظہار باقر نقوی کی شاعری کا ایک باب ہے۔ حدیثِ دل کے تو بے شمار ابواب ہیں جن کے اوراق کا مطالعہ ابھی باقی ہے۔

باقر نقوی نے ہندوستان کے ایک خاص تہذیبی اور ثقافتی ماحول میں پرورش پائی ہے۔ یہ ثقافت انھیں ورثے میں بھی ملی ہے۔ اس تہذیب وثقافت کی جڑیں اتنی گہری ہیں کہ سات سمندر پار کرنے اور گھاٹ گھاٹ کا پانی پینے کے باوجود اور روایات سے باغی ہونے کے بعد بھی باقر نقوی اس سے اپنا پیچھا نہیں چھڑا پائے ہیں۔ اس لیے ان کے نئے شعری مجموعے کے ابتدا میں نہ صرف حمد اور منقبت موجود ہے بلکہ ان کی شاعری میں کربلا اور اس کے متعلق تلازموں کو بڑی خوبصورتی اور مہارت سے غزل کے اشعار میں برتا گیا ہے:

غرق ہے الفاظ جن کے لب ثناخوانِ یزید — ان نجس ہونٹوں پہ ذکرِ کر بلا اللہ ہو
پھیر کر منہ اشقیا بھی رو پڑے اک بار جب — کاٹ کر ٹانگیں کوئی اذنِ سفر دینے لگا
اٹھے گا حشر کے دن اور بھی اک حشر جب کوئی — ردائیں اور بریدہ دست وبازو لے کے آئے گا
کوئی تم میں یزید اور شبیر ہے کس کی تقصیر ہے — لوگ کہنے لگے شہر کو کربلا، شہر والوں سنو

اس کا مطلب یہ نہیں کہ باقر نقوی ایک روایتی غزل گو شاعر ہیں کربلا اور اس سے متعلقہ تلازمات ان کے لاشعور میں موجود ہیں اور انھیں زندہ علامتوں کے طور پر انھوں نے اپنی شاعری میں شعوری طور پر استعمال کیا ہے۔

باقر نقوی کی شاعری زندگی کے تجربات اور حادثات کی متاثر کن عکاسی پر مبنی ہے۔ ان کی شاعری کا موضوع زندگی اور اس کے مسائل ہیں وہ اپنی شاعری میں نہ صرف زندگی کے مسائل کی عکاسی کرتے ہیں بلکہ اس سے نبرد آزما ہونے کی تلقین بھی کرتے ہیں، لیکن اس اظہار وتلقین میں کوئی گھن گرج نہیں ہے، ایک نزاکت اور دھیما پن نظر آتا ہے۔ وہ علامتوں اور تلازمات واستعارات کی تہ دار زبان استعمال کرتے ہیں جس کے بین السطور میں کلاسیکی غزل کا رچاؤ موجود ہوتا ہے اور یہی باقر نقوی کی انفرادیت ہے۔

باقر نقوی بنیادی طور پر روایت سے باغی ہیں، مگر روایت کا پرفریب حصار انھیں بار بار گھیرتا رہتا ہے۔ وہ سماجی نابرابری، عدم مساوات، معاشرتی ناہمواری، لسانی گروہ بندی، علاقائیت، انسانی عزتِ نفس کی بے توقیری، جہالت، استعماریت ناانصافی ظلم وجبر، استحصال، تہذیبی زوال اور راست اقدار کی شکست وریخت کے خلاف احتجاج کرتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ احتجاج زیرلب ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ اس میں ایسی کاٹ ہے کہ پتھر کا جگر بھی آب آب کرسکتی ہے:

جس پیڑ پہ رہتے ہو اسی پیڑ کو کاٹو — کیا ہو گیا تم بے ہنر ایسے تو نہیں تھے
خود بنوائے محل وہ محلے ہم سے کہے حدیث — خود تو پہنے عبا قبا ہم کو عریانی دے

ہم کو منظور نہ تھی قیدِ وفاداری شہ — ورنہ پیروں میں بھی زنجیر طلائی ہوتی

کٹنے کو ہاتھ بھی ہیں پہ سر کی ہے بات اور — دستِ طلب بڑھا کے نہیں سر اٹھا کے چل

زمیں اگر چہ نئے قحط کی لپیٹ میں ہے — رکا نہیں ہے مگر دستِ کردگار ابھی

اپنی ساکھ بنانے کا یا اپنا جرم چھپانے کو — عود و عنبر چھڑکیں گے ڈھیروں صندل جلوائیں گے

کون کہتا ہے کہ قتلِ خلق ہے فعلِ عبث — خوب ہونا چاہیے، سرکار ہونا چاہیے

ان اشعار کا خالق سات سمندر پار کا باسی نہیں معلوم ہوتا۔ ان اشعار کے خالق نے جس معاشرے میں پرورش پائی ہے جہاں وہ پلا بڑھا ہے۔ اس معاشرے کو وہ ایک لمحے کے لیے نہیں بھول پایا ہے۔ اس معاشرے میں انسانیت پر جو ظلم ہو رہا ہے اس کا وہ خود بھی ایک حصہ ہے، لہٰذا اس دکھ اور کرب کو نہ صرف محسوس کرتا ہے بلکہ اس کا اظہار بھی اپنے بھرپور شاعرانہ احساس کے ساتھ کرتا ہے اور یہ بھی چاہتا ہے کہ اس معاشرے میں تبدیلی بھی پیدا ہوا۔

باقر نقوی ایک سچا غزل گو شاعر ہے۔ غزل گوئی کی تمام نزاکتوں سے وہ اچھی طرح واقف ہیں۔ وہ اپنے تجربات و مشاہدات کو زبان دینا جانتے ہیں۔ ان کی غزل میں حدیثِ دل کے بیان کے ساتھ ساتھ دنیا کی داستانِ غم بھی تحریر کی گئی ہے۔ وہ دل کی ناکامیوں اور نامرادیوں کا اظہار ہی نہیں کرتے، وہ کائنات کے دکھ درد کو بھی موضوع بناتے ہیں اور اس کا مداوا چاہتے ہیں۔ وہ اپنے تجربات و مشاہدات کو الفاظ کے پیکر میں ڈھالنے میں مہارت رکھتے ہیں۔ اظہار ذات کے ساتھ اظہار کائنات ان کی شاعری میں ہر جگہ نظر آتا ہے مگر یہ اظہار روایتی نہیں ہے۔ اس میں جدید دور کے تقاضوں کو ملحوظ خاطر رکھا گیا ہے۔ جدید حسیت اور ہم عصر تناظر کو پیش نظر رکھتے ہوئے نئی غزل کی طرف گامزن ہونے کی ایک کامیاب کوشش نظر آتی ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ باقر نقوی اردو غزل کو دورِ جدید کے تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے میں اپنا کردار ادا کرنے کی بھرپور کوشش کرتے نظر آتے ہیں اور ان کی غزلیں جدید تناظر میں غزل گوئی کی طرف متوجہ شاعروں کے لیے مثال کی حیثیت رکھتی ہیں، کیونکہ انھوں نے غزل کو غزل ہی رہنے دیا ہے، غزل کے مزاج کو تبدیلی کرنے کی کوشش نہیں کی ہے اور نہ ہی جدیدیت کے بے ڈھنگی چال چل کر غزل کی دل بری کے بھرم کو ہی کھو دیا ہے۔

باقر نقوی زندہ علامتوں کے شاعر ہیں۔ انھوں نے اپنے اشعار میں جو علامتیں، استعمال کی ہیں، وہ مردہ نہیں ہیں نہ ہی ایسی ہیں کہ ترسیل ناکام ہو جائے۔ انھوں نے جو علامتیں، استعارے اور تشبیہات اپنے اشعار میں پیش کی ہیں، ان میں زندگی کی حرارت موجود ہے، وہ بے جان نہیں ہیں، وہ خود بولتی ہیں او رشعر کو تازگی و توانائی بخشتی ہیں۔ باقر نقوی کے قاری کو کہیں مشکل پیش نہیں آتی، کیونکہ انھوں نے جو علامتیں اپنے اشعار کو روپ دینے کے لیے استعمال کی ہیں، وہ قاری کے تجربے اور مشاہدے سے دور نہیں ہیں اور ان علامتوں نے باقر نقوی کے اشعار کے حسن میں نہ صرف اضافہ کیا ہے بلکہ ان معنویت کو تہ دار بنا دیا ہے اور رمزیت اور ایمایت کو پہلودار کر دیا ہے۔ مٹی، چاند، سورج، تارے، شاخ، گل، پھول، پانی شمع، طائر، پیڑ، پرندے، سمندر اور شہر کو باقر نقوی نے علامتوں کے طور پر استعمال کیا ہے۔ شہر سے انھیں خصوصی دلچسپی ہے۔ بار بار مختلف معنوں میں وہ اس کا ذکر اپنی شاعری میں کرتے ہیں۔ ان کی **imagiry** بھی بڑی جان دار ہے اور جو **images** انھوں نے اشعار میں پیش کی ہیں، وہ ان کے قدرتِ بیان پر مضبوط گرفت ہونے کی شہادت دیتی ہیں۔

باقر نقوی کے تیسرے مجموعۂ کلام ''موتی موتی رنگ'' میں چند نظمیں بھی موجود ہیں۔ ان نظموں کا مطالعہ کرنے کے بعد یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی نظم نگاری ابھی تجربات کے منازل سے گزر رہی ہے، مگر یہ تجربے ان کے مثبت رویوں کے نشاندہی کرتے ہیں لہٰذا ان کی نظموں کے متعلق ابھی صرف اتنا ہی کہا جا سکتا ہے کہ تجربات کی بھٹی میں تپ کر کچھ عرصے بعد وہ کندن میں تبدیل ہو جائیں گی۔ ان کی غزلوں کی طرح نظموں کو بھی پذیرائی حاصل ہوگی۔

باقر نقوی کی شاعری کا مطالعہ کرتے ہوئے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے دور کے نمائندہ شاعر ہیں۔ ان کی شاعری موجود دور کی عکاس ہے۔ ان کی شاعری کے ذریعے ہم عصر دور کے نہ صرف مسائل بلکہ جذبات و احساسات، فکر و نظر اور لہجے کی بھی شناخت کی جا سکتی ہے۔ اگر چہ انھوں نے جو دل پہ گزرتی ہے اس کا ذکر اپنی شاعری میں کیا ہے لیکن ان تمام تجربات، مشاہدات، مسائل، احساسات اور پریشانیوں سے موجودہ دور کا ہر بشر دوچار ہے اس لیے ان کی شاعری آفاقی اہمیت کی حامل ہوگئی ہے۔

باقر نقوی کی شاعری مشرقی افکار وخیالات، مشرقی تہذیب، سماجی کیفیت کی غماز ہے۔ وہ سات سمندر پار رہتے ہوئے بھی مشرق کی نمائندگی کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ انھوں نے فیشن کے طور پر شاعری میں جدت طرازی نہیں فرمائی ہے نہ سات سمندر پار کے خیالات وافکار ومسائل کو اپنی شاعری کو موضوع بنایا ہے۔ ان کی شاعری میں تصنع اور بناوٹ کا دور دور تک پتا نہیں ہے۔ ان کے شعری اظہار میں فن کارانہ حیلہ سازی نظر نہیں آتی۔ وہ راست انداز سے اپنے قلب وجگر پر گزرنے والی وارداتوں کا اظہار کرتے ہیں۔ الفاظ کے رنگ وآہنگ اور نئی تراکیب سے سجا کر اسے چیستاں نہیں بناتے۔ وہ الفاظ کے ساحر نہیں ہیں، بلکہ وہ اپنے لہجے کی جدت اور مسائل کو نئے انداز سے پیش کر کے سحر کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک شاعری صرف لذت وحظ حاصل کرنے کا ذریعہ نہیں ہے، بلکہ وہ اپنی شاعری میں مسائل کی بات کرتے ہیں اور نتائج دیکھنے کے خواہاں نظر آتے ہیں۔ ان کا اندازِ فکر، ان کے الفاظ، ان کا لہجہ، ان کا رویہ، شاعری سے ان کا Treatment سب کچھ مشرق کی نمائندگی کرتا ہے۔ اسی لیے تو کہا جاسکتا ہے کہ وہ مغرب میں مشرق کے نقیب ہیں۔

دراصل باقر نقوی ایک حساس دل رکھنے کے ساتھ ساتھ مشرق سے اپنا رشتہ توڑنے کو برداشت ہی نہیں کر سکتے کیونکہ ان کے خیالات اور افکار کی جڑیں مشرق میں ہیں اور ساتھ ہی ساتھ یہ بھی ہے کہ:

میر وغالب مر چکے، باقی تو سب ہیں گھاس پھوس ۔۔۔ حرف کے اب ہم ہیں پیغمبر ہمارے ہاتھ چوم

باقر نقوی کے نزدیک شاعری کے لطیف جذبات کو انتہائی سادگی سے بیان کردینے کا نام ہی سچی شاعری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری میں ایک نغمگی کی کیفیت ہے۔ کہیں کہیں پر تو گیت کا سا انداز ہے جو احساسِ جمال کو مہمیز کر دیتا ہے:

نام جپو نیلی چھتری والے کا میاں باقر ۔۔۔ چڑھتے دن کو سانجھ کرے جو رین کو بھور کرے

شعر سنا کوئی ایسا جس سے لگے بدن میں آگ ۔۔۔ نیند اڑ جائے جس سے ایسی کوئی کہانی دے

بستے ہوں جس دیس میں سارے ہنستے چہروں والے ۔۔۔ دیکھو صاحب اس بستی میں اپنا دل مت کھونا

چڑھتے رنگ کے ساگر میں یوں ہی تو نہیں ہم کود گئے ۔۔۔ ہم کو کیا تھا ہلکا سا اک سبز اشارہ اس نے بھی

باقر نقوی کی شاعری کے بہت سے پہلو ہیں جن پر میں اس تبصرے میں روشنی ڈالنے میں ناکام رہا ہوں۔ مجھے اس کا شدت سے احساس ہے کہ میرا یہ تبصرہ نامکمل ہے مگر میں اتنا ضرور کہنا چاہتا ہوں کہ باقر نقوی عصر حاضر کا ایک ایسا شاعر ہے جسے موجودہ دور کے مسائل کا نہ صرف احساس ہے بلکہ وہ باطن میں اتر کر اس کو سمجھنے کی بصیرت بھی رکھتا ہے۔ اسے عصری آگہی نے بے چین کر رکھا ہے اور اس کا اظہار ہی اس کی شاعری کی شناخت ہے۔ اس کا انداز پر کشش اور لہجہ منفرد ہے اور باقر نقوی سے یہ امید کی جاسکتی ہے کہ وہ اردو غزل کی روایت میں اپنے تجربات کے اظہار کی قدرت، اپنے لہجہ کی انفرادیت، اپنے جذبات واحساسات کو بیان کرنے کے انداز، اپنے براہِ راست تخاطب، اپنی سادگی کے فن کے ذریعے گراں بہا اضافہ کرنے میں کوشاں رہے گا۔

☆☆☆

باقر نقوی

غزل

جو بار بار بدلتے رہے شجر کی جگہ
ملیں گے سوکھے ہوئے پھول ہی ثمر کی جگہ
اُڑے نہیں تو پرندو سزا کے طور کہیں
اُگیں نہ پھیلے ہوئے ہاتھ دونوں پَر کی جگہ
حسد کی آگ کے بدلے لگاؤ پیار کے پھول
فضا میں تاکہ اُڑیں برگِ گل شرر کی جگہ
ہمارے بعد کا انساں عجب نہیں کہ پھرے
لیے سر اور کسی کا خود اپنے سر کی جگہ
اسی لیے تو گوارا ہے رات بھی ہم کو
کہ رات ہی میں چمکتا ہے وہ قمر کی جگہ
نہ بن سکا کبھی دشتِ سراب ہی دریا
نہ لے سکے گی کوئی روشنی سحر کی جگہ

غلام قادر آزاد۔ برطانیہ

لمحہء شوق بھی ہم رنگ بلا ہوتا ہے

فن کار بنیادی طور پر شرمیلا ہوتا ہے۔ ویسے یہ آج بھی نہیں معلوم کہ شرمیلے آدمی پیدا ہی فن کار ہوتے ہیں یا فن کار ہو جانے کے بعد شرمیلے ہو جاتے ہیں۔ یا پھر بات یوں ہے کہ کچھ تو وہ ہوتے ہیں اور کچھ اور بھی ہو جاتے ہیں اور نتیجتاً ہم کہتے رہ جاتے ہیں کہ ''تنہا نہ وہ ہاتھوں کی حنا لے گئی دل کو''۔ بہرحال شرم آج بھی اور یہ آج بھی صدیوں پر پھیلے ہوئے کل کے آج کی طرح کا نہیں بڑا چلتا پرزہ آج بھی ہے۔ ایک بڑی قدر اخلاق ہے تہذیب غم عشق جس سے وابستہ ہے۔ یہی چیز اپنے مضمرات کے ساتھ جب خاص طور پر غزل میں ڈھانپنے چھپانے الغرض نو بہ نو دکھانے کو نکلتی ہے تو تہذیب فن کی علامت بن جاتی ہے۔ باقر مجھے ان دونوں کا آمیزہ دکھائی دیتا ہے۔ پھر بھی غالب کے یہاں شرم اگر تکرار پر مائل نہیں ہوتی تو باقر کے ہاں حرکت کار پر آمادہ نہیں یعنی خاص سہل انگار ہے، میری مراد نمود ذات کے کاموں سے ہے چنانچہ اس کا پہلا مجموعہ کلام چھپ کر بازار میں آیا تو ہم نقش حیرت بن کر رہ گئے۔ مجھے فوراً وہ دو سہل انگار یاد آئے جو کسی ویرانے میں ایک بیری کے نیچے آرام فرما تھے کہ ایک کے سینے پر ایک پکا ہوا بیر آ گرا تو اس نے اچانک وہاں سے گزرتے ہوئے ایک شتر بان کو آواز دی کہ بیر اٹھا کر اس کے منہ میں رکھ دیا جائے کیوں کہ ساتھ والا اٹھ کر یہ کام کرنے کا نہیں تھا۔ شتر بان صاحب مذاق آدمی تھا وہ بھی دوسرے کی سہل انگاری سے زیادہ اس آواز دینے والا کی مستعدی پر حیران تھا۔ شعر کی بیری کے نیچے آرام کرنے والا ایک تو باقر نقوی تھا اور دوسرے تھے باقر میاں جو اپنی ہی ایک غزل کی ردیف بنے وہاں لیٹے ہوئے تھے۔ یہ ادبی شتر بان البتہ عاشور کاظمی تھا جو ادبی بیریوں کے جھنڈ سے اکثر شاداں و فرحاں یہ نعرۂ مستانہ لگاتے ہوئے نمودار ہوتا پایا گیا کہ ع.....سوئے قطار می کشم ناقۂ بے زمام را

عاشور کاظمی کہ ایک ناشر ہی نہیں شاعر بھی ہے اس لیے شاعر بھی ہے کہ کبھی تو اپنی شاعری کو بہانہ بناتے ہوئے آتا ہے اور کبھی بہانوں کو شاعری یعنی دوسروں کی کتابیں چھاپتے ہوئے انہیں اپنے ہی تخلیقی عمل کا تسلسل اور توسیع جان کر انہیں ایسا بناتا سنوارتا ہے کہ مندرجات کتاب سے ہٹ کر بھی قاری کا دل کتاب میں لگے۔ ویسے وہ شاطر بھی اچھوتا ہے جو دو زندگیوں کو داؤ پر لگا کر یہ کھیل کھیلتا ہے۔ کہ آج کی دنیا میں شاعری کرنا اور اسے چھاپنا زندگیوں کو داؤ پر لگانے ہی کے مترادف ہے۔ باقر نے جسے یوں پہچانا ہے۔

یاں ریت نما دشت ہے یا سنگ نفس پتھر ساحل پہ کسے آ کے صدا دیتی ہیں لہریں

ویسے باقر ہو یا عاشور کاظمی دونوں ہی ایسے بھی بے اثر یا **Futile** کام کرنے والے نہیں دونوں شاید اپنی کمزوریوں کی طاقت کو سمجھتے ہیں اس لیے کہ کمزور چیزیں جب اپنی کمزوری کو جان جاتی ہیں تو دراصل وہیں سے طاقت پکڑنے لگتی ہیں۔ سیلاب پتھروں کو بہا تو لے جا سکتا ہے لیکن اسے تبدیل نہیں کر سکتا۔ دیکھئے باقر نے کیا کہا ہے۔

ٹکرا کے چٹانوں سے تو مڑ جاتا ہے دریا اور ریت کی دیوار گرا دیتی ہیں لہریں

فن کار کی ٹپ ٹپ اور خطیب کے زور خطاب میں شاید یہی فرق بھی ہے۔ بہرحال ہم عاشور کاظمی کے ناقہ بے زمام کو سوئے قطار لانے کے اہتمام کے سلسلے میں ممنون احسان ہیں ویسے جس قدر ہم ہیں اس سے کہیں زیادہ وہ اپنا احسان ہم سے منوانے پر مصر ہے اس میں کچھ مضائقہ نہیں جس طرح کہ کسی میں ہو کمال اچھا ہے۔ باقر کے مزاج سے البتہ ہم سب کو معذرت بھی طلب کرنی چاہیے جو رونمائیوں کی تقریبوں کی تکرار، رفتار، بہتات اور افراط سے کسی طور لگا نہیں کھاتا اور کہتا ہے کہ

ہے بپا پھر وہی جشن مہ نخشب باقر ایک جگنو ہے کہیں وہ بھی نہ مارا جائے

جگنو کے اس استعارے کی تفصیل میں اُترنا جس میں معانی کا ایک میلہ چراغاں لگا ہوا ہے فی الحال ہمارا مسئلہ نہیں ہمیں تو اس کے جواب میں باقر کو رسماً اتنا یاد دلانا ہے کہ

سبک سری میں بھی اندیشہ ہوا رکھنا سنگ اٹھے ہو تو جلنے کا حوصلہ رکھنا
نئی فضا ہے نئے پر نکالنے ہوں گے فلک کو زیر زمیں کو گریز پا رکھنا
تمہارے جسم کے صندل کی آبرو ہے بہت ہجوم شوق میں رہ کر بھی فاصلہ رکھنا

میں نے باقر کو اس یاد دہانی کے لیے رسماً کا لفظ رسماً ہی نہیں لکھا اس سے مری مراد باقر کے یہاں اس احساس کو اجاگر کرنا ہے جس نے اس کی شاعری کو انہی بہت سی احتیاطوں کا صلہ بنا دیا ہے اور اب اس کی ان احتیاطوں نے اس کے نقادوں کے لیے بھی مبصرین کے لیے بھی اور ''تقریبئین'' کے لیے بھی ایک مسئلہ بنا دیا ہے جہاں باقر ان کے خلوص اور دیانت کو مجروح کیے بغیر خلوص اور دیانت سے بھی زیادہ کسی صداقت کا آرزو مند ہے۔ صداقت کی آرزو کی تکمیل اس کے ہاں بڑی توانا ہے چنانچہ جب وہ یہ کہتا ہے کہ۔

سچ تو یہ ہے کہ کوئی خاص ہنر مجھ میں نہیں   لوگ کہنے کو تو کہتے ہیں نہ جانے کیا کیا

تو یہ باقر کا ظاہری عجز و انکسار نہیں جس کے پردے میں وہ انا کے تازیانے لگانے کی فکر میں ہو۔ اس کے پیچھے دراصل اس کی ایک سچی تڑپ اور گہرا اضطراب ہے جن کے مباحث میں جو نا اعتباری کی یہاں سے وہاں تک پھیلی ہوئی فضا میں صدائے معتبر کی طلب کا سوال ہے جو اس نے ذاتی سطح پر ایک نیزہ بنا دیا ہے اور پھر اس کے سامنے خود کو لے آیا ہے۔

جسم پہ لگ رہ نہیں زخم نیزۂ اعتبار کے   اے مرے ہوش کچھ تو کہہ اے مرے خواب کچھ تو بول

یہ نیزہ جو دراصل ایک ترس ہے اپنے زخموں کی ارزانی کو کسی نہ کسی طرح ہر عہد میں فن کاروں کے سامنے موجود رہا ہے لیکن اعتبار کی بات نے اس کے زخموں کی معنویت کو پھیلا بھی دیا ہے اور بدل بھی دیا ہے۔ اب کیا فن کیا علم اور کیا زندگی تمام ہی اس کی زد پر ہیں۔ ذرا دنیا کے سمٹنے کی رفتار پر نگاہ ڈالئے جس نے علیحدگی، تنہائی یا **Isolation** کو واہمہ بنا ڈالا ہے اور پھر اسی عالمی افق سے اس صرصر کا احاطہ کیجیے جس نے علوم کی بنیادوں کو بھی ہلایا ہے اور سماجوں کے طے شدہ مسلمہ ڈھانچے کو بھی اخلاقی اضافیت نے جہاں زندگی کی اقدار پر کاری ضرب لگا کر آدمی کے طور گھما دیئے ہیں۔ یہی نہیں زندگی کے ہر شعبے میں بے حد **Sophisticate** ہوتی ہوئی زندگی جن تضادوں اور جن سوالوں سے دوچار ہوئی ہے اور ہوتی جا رہی ہے وہ کوئی معمولی فنامنا نہیں۔ اس نئے مظہر کو آپ نا اعتباری کا بحران کہہ سکتے ہیں۔ اس بحران نے کیا فلسفی اور کیا ماہر سماجیات، کیا سیاست دان اور کیا واعظ سب کو فکر و نظر کے محاذ پر لا کھڑا کیا ہے اس کے ساتھ ہی ساتھ شاعر، ادیب اور فن کار بھی ہیں۔ یہاں یہ بات دلچسپی سے خالی نہیں کہ فن اب خصوصاً تحریک عمل میں سوشل سائنٹسٹ کی سب سے بڑی امید بن کر رونما ہوا ہے۔ لیکن خود فن اپنے ایک ازلی خطرے سے پہلے سے زیادہ دوچار ہے اور وہ ہے فن کا ہر صورت میں فن ہی رہنا۔ انگلستان کی ایک فلسفی اور ناول نگار خاتون آئرس مرڈوک نے فلسفہ اور فن کے ناطے اپنے ایک انٹرویو میں یہ بات یوں واضح کی ہے کہ فلسفہ اگر بُرا ہو تو فلسفہ ہی نہیں رہتا لیکن فن بُرا ہونے کے باوجود فن ہی رہتا ہے۔ یہ فن کے فنی تقاضوں کی تکمیل کے بھی بعد کی بات ہے جو ہمیں شہد کی ایک خاص مکھی کی وہ ادا یاد دلاتی ہے جس میں وہ ایک بے پروا اڑان کے بعد لوٹتی ہے تو ایک کتھک ناچ ناچتی ہے برسوں کی تحقیق و تجسس کے بعد نیچرل سائنٹسٹ جسے کھولنے اور **Decipher** کرنے میں کامیاب ہوا ہے تو اب بتاتا ہے کہ اس کتھک ناچ میں مختلف زاویوں سے ناچتی ہوئی شہد کی مکھی دراصل اپنے اراکین معاشرہ پر کئی راز کھولتی ہے جو غذا کے نئے سرچشموں کی نوید ہی نہیں ہوتی بلکہ ان کے محل وقوع کا پورا خبر نامہ ہوتی ہے جس کے بدولت غذا کے ان نئے سرچشموں تک اس کے ہم چشموں کی رسائی آسان بنتی ہے فن کار بھی اپنے منصب میں شہد کی اس خاص مکھی کی مثل ہوتا ہے وہ اگر جبلت کے دائرے میں بقا کا اور اپنی نوع کے تسلسل کا موجب ہوتی ہے تو فن کار ذہن و فکر کے دائرے میں نئی اقدار کی نشان دہی کا وسیلہ بنتا ہے اس کے ہاں اگر وہ شاعر ہے تو زبان ایک کتھک ناچ ناچتی یہ تشبیہ، استعارہ، علامت، رمزیت، رجائیت، ابہام، ایہام، سب اسی رقص کے زاویے ہیں جن سے کچھ صداقتوں کے ابلاغ کا جھرنا پھوٹتا ہے اور یوں ''ایک سے اجتماع'' کا ایک نیا رشتہ استوار ہوتا ہے۔ اگرچہ خوں شدہ ذاتی اناؤں سے کچلی ہوئی شخصیتوں سے، زندگی کو گہرے فکر سے لایعنی قرار دے کر اسے **Adburd** ثابت کرنے کو بھی فن بنایا جا سکتا ہے اور بنایا گیا ہے جس کی تفصیل ہم مقامی حوالوں سے بھی اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں اور عالمی ادبی حوالوں سے بھی مثلاً اس کے لیے ذرا نوبل ادب انعام سے پیدا ہونے والی صورت حال ہی کو لیجیے تو وہاں برنارڈ شا بھی ہے اور بیکٹ بھی۔ کپلنگ بھی ہے اور سارتر بھی علیٰ القیاس، فن کے خمیر میں مضمر ایک خوبی یا خرابی نے وہ بُرا ہو تو بھی فن ہی رہتا ہے باقر کی جشن مہ تخشب کی بات کو بہت بلیغ بنا دیا ہے جو پوری ادبی تنقیدی صورت حال پر تنقید بھی ہے اس میں جگنو کی بلاغت بھی واضح تر بلکہ روشن تر ہو کر سامنے آتی ہے۔ ذرا اقبال کی زبان سے پروانے اور جگنو کا مکالمہ بھی سامنے رکھئے تو اور بھی روشن، تاریکی کی بہت بڑی قوتوں کے مقابلے میں جگنو اپنا وجود بڑی اہمیت رکھتا ہے یہاں مجھے موبی ڈک کے ایک نقاد کا یہ جملہ یاد آتا ہے کہ فن وہاں کامیاب ہوتا ہے جہاں تجربہ اصل کے پورے ادراک

میں ناکام رہتا ہے۔کمزور ونحیف جگنوفن کی اسی قوت کا استعارہ بھی ہے۔ویسے اگر ہم فی الحال باقر کی آواز کو غنچہ کہہ لیں تو اس عالم میں بھی وہ غرقۂ دریائے رنگ ہے اور وہ ان امکانات کا دریچہ بھی ہے جن کی طرف اس کے ممتاز دیباچہ نگاروں نے تازہ ہوا کی نشان دہی کی ہے۔ان ہی میں ایک جگہ بطور خاص فضائے نااعتباری شمہ جشن مہ نخشب کا اشارہ بھی ملتا ہے یہ مقام وہ ہے جہاں رک کر عالی جی نے باقر سے ہر طرح کی عدم تعلق کی وضاحت کو ضروری سمجھا اور یوں گویا خود اپنے بیان کو ایک معروضی اساس دے کر تازہ ہوا کی تاثیر کے معتبر پہلوؤں کی پردہ کشائی کی ہے یہ ہے ذمہ داری کا وہ بوجھ فن کے حوالوں سے جو باقر اپنے تنقیدی شعور پر ڈال رہا ہے اور ساتھ ہی ساتھ اسے اپنے نقادوں پر بھی اس زاویے سے دیکھیں تو باقر شرمیلا تو ہے مگر اعتماد سے عاری نہیں۔کم گو ہے مگر تاریک جوئی یا **Obscurantism** اس کا مسلک ہی نہیں سہل انگار ہے مگر تخلیق کے عملی مطالبوں سے گریز پا نہیں اس کی ان خرابیوں میں تعمیر کی جو صورتیں گندھی ہیں وہ ان تین شعروں تک محدود نہیں لیکن یہ تین اشعار اس کے نہاں خانۂ ذات تک ہماری رہنمائی خوب کر رہے ہیں۔

جاری ہو نغمۂ حیات تار رباب کچھ تو بول
ایک جگنو ہے کہیں وہ بھی نہ مارا جائے

کتنے سمندروں کا خون پی گئی بے حسی کی ریت
عظمت خاک اب تو اٹھ، عہد سراب کچھ تو بول

جسم پہ لگ رہے ہیں زخم نیزۂ اعتبار کے
اے مرے ہوش کچھ تو کہہ، اے مرے خواب کچھ تو بول

اس بولتی ہوئی ردیف کے اندر چپ کے جو چھپے ہوئے مقامات ہیں انہی میں باقر کا ہنر کھلتا ہے وہ بیشک لاکھ کہتا رہے کہ ”سچ تو یہ ہے کہ کوئی خاص ہنر مجھ میں نہیں“ اسے نہ صرف ایسا کہتے رہنا چاہیے بلکہ مزید سمجھتے رہنا بھی چاہیے کہ نمود فن ہو یا نمود ذات دونوں کا ارتقا اسی سے وابستہ ہے۔اسی کی بدولت تو وہ فتح مندیوں کے عمومی طمطراق میں سچ کی موت کا منظر نامہ لکھنے سے مجتنب رہا ہے۔وہ جو اپنے سچ کو بھی حتمی قرار دے کر کسی شہید کی جنگ نہیں لڑتا۔اس سے اس میں نہ تو معشوقانہ خود مرکزی نظر آتی ہے اور نہ عاشقانہ دوروں بینی البتہ زندگی کے بارے میں ایک گہری **Understanding** ضرور ہے، دیکھئے ؎

یہ کیا کہ اک اڑان ہی میں کٹ گئیں مسافتیں
عطا کیے ہیں بال و پر تو ہم کو آسماں بھی دے

نہ جانے کب سے ہم پہ قرض ہے جنوں کی داستاں
سلیقۂ بیاں دیا تو اب ہمیں زباں بھی دے

لگاؤ دوستو دلوں میں کرب آگہی کی آگ
جو گرم جسم کو رکھے کبھی کبھی دھواں بھی دے

غور کریں تو یہی **Understanding** شعر وادب کا اثاثہ بھی ہے اور منجملہ آثار حیات بھی ہے اور وقار فن بھی۔جس سے زندگی اپنے بحران اور ہذیان کی راہوں کا سراغ پاتی ہے ایک **Liberating Insight** حاصل کرتی ہے یہی اندر سے آدمی کو متحرک کرنے والی بصیرت بالآخر ایک قوت بنتی ہے ایک تہذیبی قوت جو رفتہ رفتہ تاریخ پر اثر انداز بھی ہوتی ہے ؎

کمال پانیوں کا تھا کہ راستے بنالیے
ندی کی راہ میں مہیب کوہسار کب نہ تھا

بیکار زمینوں کو نگل جائے کہیں جنگل
روکو گے مسافر کو تو رستہ نہ رہے گا

تازہ ہوا کی حد تک باقر غزل کے شاعر ہیں۔غزل جو ایک بڑی ہی جرات آزما صنف ادب ہے کہ باہر سے ڈھائے جانے پر آمادہ نہیں لیکن اپنی اندرونی توسیع پر مسلسل اصرار کرتی آرہی ہے اور لطف کی بات یہ ہے کہ ہمارے فن کاروں نے کمال کی تخلیقی توانائی سے یہ معجزہ بھی کر دکھایا۔انہوں نے غزل کو عہد بہ عہد زندگی کا اس کے خارجی تقاضوں کی پاسداری کے ساتھ کامیاب ترجمان بنایا۔اگر ہمارا زمانہ ذرے کی بے پناہ توانائیوں اور انگنت امکانات کا زمانہ ہے سائنسی طور پر اس کی قوت نمائیوں کا عہد ہے تو ادبی احوال میں غزل بھی ذرے کی حریف ہے اور دونوں کے لیے ایک بات مشترک ہے ”لہو خورشید کا ٹپکے اگر ذرے کا دل چیریں“۔غزل اپنی ریزہ کاری کے باوصف بلکہ میں کہوں گا اس کی وجہ سے اس مقام تک پہنچی ہے کہ اس نے ہمارے ذوق جمال اور اپنی جمالیات کی کایا پلٹ کر رکھ دی ہے اب اس سے بہت سارے بشری تقاضوں کی نسبت فکری تقاضوں کا مطالبہ کرتے ہیں۔ان تقاضوں کو باقر بڑی حد تک خوب جانتے ہیں اس لیے اس کی غزل صیغہ اظہار میں اپنے عہد سے ہم آہنگ ہے دوسرے معنوں میں انہوں نے زندگی کی گہری **Understanding** کو غزل کی جمالیاتی زبان میں اپنے عہد کی زندگی کی مثبت معنوں میں **Understanding** بنا دیا ہے جس کی تفصیل میں اتر کر ہم باقر اور باقر کی غزل کی انفرادیت کا سراغ لگا سکتے ہیں۔یہی ہے تازہ ہوا کی تاثیر اور یہی ہے باقر کا امتیاز

باقر نقوی، لندن

چھوٹا منہ اور بڑی بات
(ترقی پسند تحریک کا ایک احتسابی جائزہ)

جب زمیں پر پہلی بار سورج چمکا، پہلی صبح نے تاریک دھرتی پر اپنا نور بکھیرا اور جب پہلی کونپل نے منوں مٹی کی تہوں کو توڑ کر اپنا سر نکالا وہیں سے اس کرۂ ارض پر ارتقا کا عمل شروع ہوا۔ جو خدا پر یقین رکھتے ہیں ان کے لیے قدرتِ خدا اور جو خدا کو نہیں مانتے ان کے نزدیک نظامِ ارضی کے اولین مظاہر میں وہ عمل دکھائی دیا جس کو ترقی یا ارتقا کا عمل کہتے ہیں۔ پھر یوں ہوا کہ ارتقا ہی ارتقا نہیں، روشنی کے بعد اندھیرا، طلوع کے بعد غروب اور کونپل پتے اور پھول کے بعد خزاں کے تخریبی عمل نے ارتقا میں جہد کا زاویہ پیدا کیا یعنی یہ کہ ترقی کے لیے کوشش، منفی طاقتوں سے نبرد آزمائی کے بعد کسی منزل پر پہونچنا۔

جیسے جیسے انسان تہذیب کی منزلیں طے کرتا گیا اس کے دل میں بہتر سے بہتر زندگی گزارنے کا جذبہ بڑھتا گیا اور اسی جذبے سے ارتقا کے عمل میں تسلسل پیدا ہوا۔ انسان نے جہل کے اندھیرے کو علم کی روشنی سے چاک کرنے کی کوشش، زندگی کو بہتر ماحول بنانے کی فکر کی اور اس کے اعلیٰ مقصد کے حصول کی بنیاد رکھی۔ اعلیٰ مقصد منزل ہے جو متحرک ہے اس طرح کہ مسافر جب منزل پا لیتا ہے تو ایک اس سے بہتر منزل وجود میں آ کر اس کو پھر سے گامزن کر دیتی ہے لہٰذا اعلیٰ مقصد وہ ناقابلِ گرفت شے ہے جس کا حصول انسان کو مسلسل متحرک رکھنے کا ضامن ہوتا ہے۔

روزِ ازل سے انسان ارتقا کی کوشش میں ہے اور یہ کوشش ہمہ جہت ہے یعنی معاشرتی، تہذیبی، دینی، ادبی، آپ کسی قوم اور ملک کے انسان کو رجعت پسند کہہ کر دیکھ لیجیے اگر اس میں ذرہ برابر بھی علم کی روشنی اور آگہی کا جذبہ ہوگا تو وہ اس خطاب کو اپنی تحقیر سمجھے گا اس لیے کہ فطرتِ انسانی آفرینش سے ترقی پسند ہے۔

دنیا کی ہر زبان، ہر ادب میں یہی کیفیت ملتی ہے کہ جب تک وہ ترقی پذیر رہتا ہے، پھلتا پھولتا ہے، زندہ رہتا ہے اور جوں ہی یہ قوت نمو (Living Force) ختم ہوتی ہے وہ زبان بھی مر جاتی ہے اور وہ قوت بھی۔ اردو زبان اپنی پیدائش سے لے کر آج تک ارتقا پذیر ہے جس کی پہچان یہ ہے کہ اس میں نئے الفاظ، نئے خیالات، نئے اثرات شامل ہوتے رہے ہیں اور یہ زبان ان کو قبول کرتی رہی ہے، اسی طرح اس کا ادب منظوم ہو یا منثور ارتقا کے منزل سے گزرتا رہا ہے۔ اردو زبان کی Stone Age میں بھی ترقی پسندی کی علامات ملتی ہے۔ چونکہ ہر زمانے میں ترقی پسندی کے معیار بدلتے رہتے ہیں اس لیے اس کے لوازم اور اس کی صورتیں بھی مختلف ہوتی ہیں۔ سو برس پہلے کی غالبؔ کی شاعری بھی ترقی پسندی کی مثالوں سے بھری پڑی ہے۔

تنقید جو اردو ادب کی سب سے جدید صنف ہے کیا ہے۔ ادب کی خوبیوں اور خرابیوں کی نشاندہی کرنا، ادب کو اعلیٰ مقاصد کی راہ دکھانا اور اس کو بہتر تخلیق کے لیے روبہ عمل کرنا۔ کیا یہ عمل بذاتِ خود ترقی پسندی نہیں۔ حالیؔ کی تنقید کیا اردو ادب میں ترقی پسندی کی ایک نئی جہت نہیں تھی۔ نظیر، چکبستؔ، اقبالؔ نظم اور نثر میں ڈپٹی نذیر احمد، مرزا ہادی رسواؔ، مظہر جانِ جاناں کے ادب پارے کیا سب بے مقصد تھے، کیا ان میں اعلیٰ مقاصد حاصل کرنے یا اُجاگر کرنے کی کوشش نہیں تھی۔

ہر تحریک ظہور میں آنے سے پہلے آہستہ آہستہ جڑیں پکڑتی رہتی ہیں اور کوئی حادثہ، کوئی واقعہ یا کوئی بیدار ذہن اس کو نہاں خانوں سے نکال کر ایک جاندار تحریک بنا دیتا ہے۔ **۱۹۳۵ء میں انجمن ترقی پسند مصنفین کی تشکیل کا اعلان بلاشبہ سجاد ظہیر، ملک راج آنند، ڈاکٹر گھوش، دین محمد تاثیر** اور رشید جہاں جیسے بیدار ذہنوں کا ایک سنہرا کارنامہ تھا، لیکن یہ کہنا غلط ہوگا کہ ترقی پسند تحریک کی ابتدا بھی اس انجمن کی تشکیل کے اعلان کے ساتھ ہوئی، ترقی پسند تحریک تو ایک رو تھی ایک دبی ہوئی آگ تھی جو آہستہ آہستہ سلگ رہی تھی۔ میکسم گورکی، پیرس کانفرنس، اسپین کی خانہ جنگی، آسٹریلیا میں مزدوروں کی بظاہر ناکام مگر دور رس نتائج کی حامل بغاوت وغیرہ ایسے واقعات ہیں جنھوں نے سجاد ظہیر اور ان کے رفقاء کو اردو ادب میں ایک نئی جہت کی راہ دکھائی۔ ہندوستان کے حوالے سے اختر حسین رائے پوری کا مضمون ''ادب اور زندگی'' وہ پہلی مربوط کوشش تھی جس نے اس سلگتی ہوئی چنگاری کو شعلہ بنانے میں اور اس جذبے کو دھارے کی شکل دینے میں اہم کردار ادا کیا۔

اس میں شک نہیں کہ ۱۹۳۵ء میں لندن میں انجمن ترقی پسند مصنفین کے قیام اور اعلانِ لندن نے ادب کے ذریعے اعلیٰ مقصد کے حصول کا پرچم بلند کیا

جس کا پورے برصغیر میں بے پناہ خیر مقدم کیا گیا۔ نئے لکھنے والوں کے ساتھ ساتھ ان قدآور شخصیتوں نے بھی اس کو تحسین کی نظروں سے دیکھا اور اپنی آشیرباد دی، جو اپنی ارفع منزلوں میں قدم رکھ چکے تھے جیسے ٹیگور، اقبال وغیرہ۔

لندن کے بعد لکھنو، الہ آباد اور برصغیر کے دوسرے شہروں میں ترقی پسند تحریک کے پرچم بلند ہوئے اور دیکھتے ہی دیکھتے نہ صرف اردو بلکہ برصغیر کی ساری زبانوں کے قابل ذکر اہل قلم ادب برائے زندگی کے پرچم تلے جمع ہو گئے۔ ۱۹۳۵ء سے ۱۹۴۷ء تک کا دور ترقی پسند تحریک کا سنہرا دور تھا۔ ہندوستان کی تحریک آزادی میں ترقی پسند اہل قلم نے کارہائے نمایاں انجام دیئے۔ اس دور میں برطانوی سامراج کے حامیوں کی ہر مخالفت نے تحریک کے لیے مہمیز کا کام کیا۔ مثلاً ۱۹۳۶ء کی لکھنو کانفرنس کے بعد کلکتہ کے اخبار Statesman نے اپنے برطانوی آقاؤں کی ایما پر تحریک کی مخالفت کی تو امرناتھ جیسے صرف چند حضرات بھی اپنی حمایت کا اعلان واپس لینے کے باوجود پس پردہ تحریک کا ساتھ دینے پر مجبور رہے۔ اس کے بعد کے واقعات میں ۱۹۳۷ء میں پنجاب کسان کمیٹی کے ساتھ مل کر تاریخی جلیانوالہ باغ میں ترقی پسند تحریک کانفرنس اور اس کانفرنس میں یوپی کے کسانوں کے نمائندے کی حیثیت سے سجاد ظہیر اور کنور محمد اشرف کی شرکت ۱۹۳۸ء میں الہ آباد کانفرنس میں ہندی کے ممتاز شاعر میتھلی شرن گپت کی شرکت، دسمبر ۱۹۳۸ء میں رابندر ناتھ ٹیگور کے خطبے سے کلکتہ کانفرنس کی ابتدا۔ منشی پریم چند، جواہر لال نہرو اور ایسے بہت سے اکابرین کی اس تحریک میں شمولیت اور ایسے بہت سے واقعات ہیں جن سے تحریک کی ہمہ گیری کا ثبوت ملتا ہے۔ کیفی اعظمی، مجروح سلطان پوری، سردار جعفری، مخدوم، فیض، مجاز اور ایسے کتنے ہی ترقی پسند شعرا کی نظمیں اور عوامی گیت برطانوی سامراج کے خلاف جنگ آزادی لڑنے والے مزدوروں، کسانوں اور کارکنوں کے لیے مشعل نور بنے رہے۔

اس ساری ہر دلعزیزی کے ساتھ ساتھ اس تحریک کا ایک پہلو ایسا بھی تھا جسے جب بھی ہدف تنقید بنایا گیا ترقی پسند جس کا مسکت جواب نہ دے سکے۔ وہ پہلو یہ تھا کہ تحریک کے تمام اکابرین اول تو زیادہ تر کمیونسٹ تھے اور جو باقاعدہ پارٹی ممبر نہ تھے وہ بھی اشتراکیت کا دم بھرتے تھے۔ اصغر علی انجینئر نے "ترقی پسند ادب پچاس سالہ سفر" (مرتبہ ڈاکٹر قمر رئیس اور سید عاشور کاظمی) میں اس کی یوں وضاحت کی ہے: "۱۹۴۲ء میں چند ماہ کے باہمی مباحثوں کے بعد غیر قانونی کمیونسٹ پارٹی نے جنگ میں اتحادیوں کی حمایت کا اعلان کیا تو حکومت ہند نے اس کے نمائندوں سے طویل خفیہ مذاکرات کے بعد اسے قانونی مان لیا۔ ادھر کانگریسی رہنما گرفتار کر لیے گئے اور مسلم لیگی اکابرین کی توجہ مسلمانوں کے مستقبل سے وابستہ ہو گئی تو کمیونسٹ حضرات کو میدان خالی مل گیا"۔

مندرجہ بالا وضاحت درست سہی مگر یہ ۱۹۴۲ء کے بعد کے حالات کا احاطہ کرتی ہے حالانکہ ترقی پسند تحریک کی ابتدا ۱۹۴۲ء تک کی صورت حال بھی کچھ مختلف نہ تھی سجاد ظہیر، کیفی اعظمی، ڈاکٹر علیم، کرشن چندر، مجاز، سبط حسن، مخدوم، سردار جعفری، احتشام حسین، اعجاز حسین، فیض غرض کہ کسی بھی اہم نام پر توجہ دیجئے وہ مارکسٹ نظر آئے گا۔ اشتراکیت بذات خود کوئی بُرائی نہیں، خود اسلام (کارل مارکس سے صدیوں پہلے) اشتراکی نظام کی تعلیم دیتا ہے۔ فرق صرف حاکمیت اعلیٰ کا ہے۔ اسلام میں حاکمیت اعلیٰ ذات خداوندی کے لیے مختص ہے جبکہ اشتراکیت میں حاکمیت اعلیٰ افراد اور اشتراکی نظام کے حوالے کر کے "گلاس نوس" اور "پروسترائیکا" کا انتظار کیا جاتا ہے۔ ترقی پسند تحریک اگر اشتراکیت کی اصلی ہیئت (Generic Form) کو اپنا لائحہ عمل بناتی، اس کی روح کو اپنے منشور میں ڈھالتی یا پھر برصغیر کی جغرافیائی حدود کی ضرورتوں کے پیش نظر اس کو نئی صورت عطا کرتی تو نہ صرف یہ تحریک ہر انسان کے دل کی دھڑکن بن جاتی بلکہ ان سامراجی قوتوں کو جو برصغیر کے استحصال میں مصروف تھیں اس تحریک کو ہدف بنانے کے لیے اتنے آسان مواقع نہ ملتے۔ مذہبی ذہن اس سے دور نہ ہوتے اور Fence پر بیٹھنے والے بھی سامراجیت کی پبلسٹی کے شکار نہ ہوتے۔

ترقی پسند تحریک جب ایک مثبت تحریک ہے، انسان کے اعلیٰ مقاصد کے حصول کی جدوجہد کرتی ہے، جبر، استحصال اور سامراجی قوتوں سے ٹکرانے کا اعلان کرتی ہے تو پھر اس کو "بائیں بازو" کا Stigmatised نام کیوں دیا گیا، اس کو دایاں بازو کیوں نہیں کہا گیا۔ دراصل یہ وہی سامراجی استحصالی قوتوں کی دور اندیش حکمت عملی تھی جس نے اپنی راہ کا کانٹا ہٹانے کے لیے تحریک کو ایک بدنما نام دے دیا اور بدقسمتی سے تحریک نے اس کو قبول بھی کر لیا۔ ترقی پسند اہل قلم کی انتہا پسندانہ حکمت عملی نے صورت حال کو اور خراب کیا۔ مذہب سے باقاعدہ حتیٰ کہ برائے نام تعلق رکھنے والوں نے بھی جو پروگریسو خیالات رکھتے تھے خود کو روسی اشتراکیت کا ادبی بازو (Literary Arm) کہلانا پسند نہ کیا۔ دراصل تحریک میں شامل بعض حضرات بھی اسی انتہا پسندانہ پالیسی سے گھبرا کر تحریک سے الگ ہو گئے۔

انسان اور اس کے دکھ درد میں شریک رہنے والے کسی ادیب کو اگر کسی اشتراکی ملک سے علاج معالجے کی سہولتیں مل جائیں، آمد و رفت کے اخراجات

دیئے جائیں ،انعامات سے نوازا جائے تو میری نظر میں کوئی حرج نہیں اس لیے کہ معاشرے کے رستے ہوئے ناسور پر نشتر لگانے والا قلم کار انسانیت کے اجتماعی امراض یعنی غلامی، بھوک، بیماری سے لڑنے والا اگر خود میں بیمار ہو جائے تو کوئی تو اس کی کفالت کرے مگر بات تو وہاں بگڑتی ہے جب جبر و استحصال کے خلاف جہاد کرنے والے قلم کار سائبیریا کے ان قید خانوں کے خلاف آواز بلند نہیں کرتے جو ضمیر کی زبان استعمال کرنے والوں سے بھرے پڑے ہیں۔کوئی ادیب جب نکارگوا میں امریکی بربریت کے خلاف قلم استعمال کرتا ہے تو مجھ ایسے ناتواں لیکن سینے میں انسانیت کا درد بسائے ہوئے لوگوں کی نگاہوں میں ہمت ،عزم اور حوصلے کی چمک آجاتی ہے لیکن جب مشرقی جرمنی، ہنگری، چیکوسلواکیہ اور پولینڈ میں جبر و بربریت کی بدترین مثالوں پر ہمارے محبوب اور قابل تعظیم اہل قلم چپ نظر آتے ہیں تو یوں محسوس ہوتا ہے گویا ہر جسم پر کئی کئی چہرے ہیں اور ہر چہرے پر کئی کئی نقابیں ہیں۔اسٹالن کی ہڈیوں کا کریملن کے حرم سے نکال کر پھینک دیا جانا اور گورباچوف کے گلاس نوس کا اعلان ماضی کے اشتراکی جبر و استحصال کا اقرار ہے کہ نہیں ،غلطیوں کا یہ اعتراف بڑائی سہی مگر ماسکو نواز ارباب فکر کے لیے درس عبرت بھی ہے ۔

سجاد ظہیر نے کہا تھا:’’ یہ ایک افسوسناک حقیقت ہے کہ کمیونسٹوں نے اور کمیونسٹ ریاستوں نے بعض موقعوں پر (مثلاً سویت یونین میں اسٹالن کے عہد میں)اس غلط فہمی میں مبتلا ہو کر کہ فنکاروں کو ایک خاص سیاسی نقطہ نظر کی ترویج کرنی چاہیے (یہ نقطہ نظر چاہے صحیح ہی کیوں نہ ہو) فنکاروں کی آزادیٔ تخلیق پر پابندیاں عائد کیں۔اس کے سبب نہ صرف خود ان کا فن مجروح ہوا بلکہ وہ فنکار بھی جو ان کے ساتھ آسکتے تھے ان سے دور چلے گئے۔ضرورت ہے کہ فنکار سچائی اور خلوص کا دامن نہ چھوڑیں اور فن میں ان ہی خیالات و جذبات کا اظہار کریں جنھیں وہ اپنی روح کی گہرائیوں میں محسوس کرتے ہیں‘‘۔(ماخوذ از روشنائی ،سجاد ظہیر، ترقی پسند پچاس سالہ سفر)

افراد کی قربانیاں ہی تحریکوں کو جلا دیتی ہیں اور افراد کی لغزشیں یا غلط روی ہی تحریکوں کی موت کا سبب بنتی ہے۔ترقی پسند تحریک میں شامل افراد کی بے مثال لگن، جد و جہد اور تحریک کے لازوال دستور کے باوجود ان کی غلطیوں نے تحریک کو بہت نقصان پہنچایا۔

انجمن ترقی پسند مصنفین کے حوالے سے تحریک کے تین ادوار ہو سکتے ہیں۔۱۹۳۵ء سے ۱۹۴۲ء تک کا سفر، ۱۹۴۲ء سے برصغیر کی آزادی ہی نہیں بلکہ ۱۹۴۹ء کی بھیمڑی کانفرنس تک کا دور اور ۱۹۵۰ء کے بعد سے ابتلا کا زمانہ۔پہلے دور میں تحریک خوب پھولی پھلی اور اس کا چرچا قریہ قریہ گلی گلی ہوا اور لوگ اس میں جوق در جوق شامل ہوئے۔کل ہند بھیمڑی کانفرنس (مئی ۱۹۴۰ء) بقول محمد علی صدیقی ’’ایک لحاظ سے یورپی زوال پرست ادباء کی منفی یاس انگیز اور وجودی لہر کے مقابلے میں برصغیر کی حقیقتوں کا اس قدر برملا اعلان ہے کہ بعض ترقی پسندوں کو بھی اس کی سخت گیری کا اعتراف ہے‘‘۔ یہ ایک موڑ تھا جو بعد میں تحریک کے دھارے کو صاف اور واضح طور پر’’بائیں‘‘ جانب لے گیا۔

ہندوستان میں چونکہ روسی اثرات گہرے تھے اس لیے وہاں ۱۹۵۰ء کے بعد تحریک اگرچہ بہت فعال نہ رہ سکی لیکن کچلی بھی نہ جا سکی جبکہ پاکستان میں جہاں مغربی سامراج اپنے مہیب پنجے گاڑ چکا تھا اس کی پوری طرح بیخ کنی کی گئی جو اردو ادب کے لیے ایک سانحہ تھا ہر چند کہ ترقی پسند ادیبوں نے پاکستان میں اس سارے عرصے میں معیاری ادب تخلیق کیا لیکن تحریک اور اس کی تنظیم ایک ایسی زندہ لاش کی طرح تھی جسے **life support** کے ذریعے باقی رکھنے کی کوشش کی جارہی ہو۔

لندن میں ۱۹۸۵ء کی ترقی پسند تحریک کی گولڈن جوبلی ایک ایسا کارنامہ تھا جس نے اس نیم مردہ جسم میں نئی روح پھونک دی۔اس اجتماع نے جہاں اونگھتے ہوئے ترقی پسند ذہنوں کو جھنجھوڑا وہاں وادیٔ ادب کے تازہ واردوں کو بھی تحریک سے روشناس کرایا۔اس دو روزہ اجتماع میں تین نسلوں کے نمائندوں نے شرکت کی ۔میرا نام اگرچہ انجمن ترقی پسند مصنفین کے کسی رجسٹر میں باقاعدہ درج نہیں ہے لیکن میں ادب برائے زندگی اور مقصدی ادب پر ایمان رکھتا ہوں۔لندن کانفرنس کی ابتدائی تیاریوں سے لے کر اس کے اعلان نامے تک کی منازل اور دشواریوں سے گزرنے کے دوران میں نے دیکھا کہ اس اعلان نامے میں بھی ایسے جملے شامل کرانے کی کوشش کی گئیں جس کا اقتباس ان سارے علائم کا نچوڑ تھا جس کا تجزیہ اس مضمون میں کیا جا چکا ہے۔لیکن یہ کوششیں بار آور نہ ہوسکیں جس کا سہرا سبط حسن، سردار جعفری، ملک راج آنند، قمر رئیس اور عاشور کاظمی کی اعتدال پسندانہ پالیسی کے سر ہے۔غالباً یہ ماضی کے تجربات کا نتیجہ اور یقیناً خوش آئند نتیجہ تھا۔

ترقی پسند تحریک کا یہ دور جو لندن کانفرنس ۱۹۸۵ء سے شروع ہوا،خوش آئند ہے۔لندن کے بعد کراچی اور اس کے بعد ۱۹۸۶ء کے پورے سال لکھنو، الہ آباد، دہلی ، بہار اور ہندوستان کے بڑے شہروں میں گولڈن جوبلی کی تقریبات میں سب سے اہم بات جو سامنے آئی وہ یہ تھی کہ تحریک کے کارواں میں اب ایسے لوگ بھی نمایاں نظر آتے ہیں جو آزاد ذہن کے مالک ہیں یعنی جن کا تشخص ’’دائیں‘‘ یا ’’بائیں‘‘ سے نہیں ہوتا۔میرے نزدیک یہ ایک نیا اور نہایت اہم موڑ ہے۔جہاں

تک میری ناقص معلومات کا تعلق ہے غالباً پہلی بار گولڈن جوبلی کانفرنس الہ آباد ۱۹۸۶ء میں ڈاکٹر قمر رئیس نے انجمن ترقی پسند مصنفین ہند کے سیکرٹری جنرل کی حیثیت سے یہ اعلان کیا کہ: ''انجمن ترقی پسند مصنفین کا کمیونزم یا کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا سے کوئی براہ راست تعلق نہیں ہے، یہ درست ہے کہ بہت سے کمیونسٹ ساتھی انجمن کے رکن یا عہدے دار ہیں، میں خود مارکسٹ ہوں لیکن ہم لوگ اس لیے ترقی پسند مصنفین میں شامل ہیں کہ ہم اس کے دستور سے متفق ہیں''۔

اس سے ذرا پہلے لندن کانفرنس ۱۹۸۵ء میں برطانیہ کے سیکرٹری جنرل عاشور کاظمی نے اپنی رپورٹ میں کہا تھا کہ: ''ہم نے مشرق، مغرب، شمال، جنوب کہیں سے کوئی مدد حاصل نہیں کی''۔ لیکن الہ آباد کانفرنس میں اس اعلان کی وضاحت کی کہ: ''یہ الزام غلط ہے کہ انجمن ترقی پسند مصنفین یا ترقی پسند تحریک روس سے ہدایات حاصل کرتی ہے۔ ہمارے کیمونسٹ ساتھی ہمارے منشور سے متفق ہیں لہٰذا ہمارے ساتھ ہیں۔ ہم کیمونزم کی ان ساری قدروں کا احترام کرتے ہیں جو انسانیت کی بہبود سے متعلق ہیں لیکن ہم کسی سے ہدایات نہیں لیتے۔ جیسا کہ قمر رئیس صاحب نے اعلان کیا ہے وہ مارکسٹ ہیں، اسی طرح میں یہ اعلان کرنے میں فخر محسوس کرتا ہوں کہ میں مسلمان ہوں، ہمارا کسی مذہب سے ٹکراؤ نہیں تاوقتیکہ کوئی مذہب اس حد تک بنیاد پرستی کا پرچار نہ کرے کہ انسانی قدریں پائمال ہو جائیں اور انسانی قدروں کی پائمالی کا نام مذہب کبھی نہیں ہوسکتا''۔

ایسے جرات مندا اعلانات اور ترقی پسند تحریک کا یہ اعتدال پسند رویہ ایک روشن مستقبل کا پیش خیمہ ہے۔ اس تحریک کے بہت سے رہنما میرے بزرگ اور لائق احترام ہیں۔ میں ان کی خدمت میں مودبانہ عرض کرنا چاہوں گا کہ جو کچھ ان سطور میں کہا گیا ہے وہ ان کی تضحیک نہیں، یہ تو انہیں سے اکتساب کیا ہوا خود احتسابی کا جذبہ ہے جس نے میرے نحیف قلم کو اتنی جسارت دی ہے۔

میں آخر میں ترقی پسند تحریک کے ایک ادبی محسن کی آواز کو **Amplify** کرنا چاہوں گا جو تحریک کے نقار خانے میں ایسے کھلے ذہنوں کی تلاش میں ہے جو تحریک کو آفاقیت دے سکیں بعض اوقات بہت ہی چھوٹے اور مبتدی ذہن بھی بہت پتے کی بات کہہ جاتے ہیں حالانکہ عاشور کاظمی اجتماع لندن کے بعد نہ چھوٹے رہے اور نہ مبتدی۔ ترقی پسند تحریک کے ارباب بست وکشاد ایک لمحے کو ان گزارشات کو قابل اعتنا سمجھیں تو شاید کوئی اور بھی خیر کا پہلو نکل آئے۔

میرے خیال میں ترقی پسند تحریک کی فلاح اسی میں ہے کہ اس کی گردن سے اشتراکیت کا طوق اُتار دیا جائے اور اس میں آزاد فکر اور حقیقی ترقی پسند اہل قلم کو آگے لایا جائے۔ اگر ایسا نہ کیا گیا تو شاید ۲۰۳۵ء میں پھر کوئی عاشور کاظمی پیدا ہو جو اس حنوط شدہ لاش کو نیا کفن پہنا کر تزک واحتشام سے اہرام نما عجائب گھر میں عوامی نظارے کے لیے رکھوا دے۔ یوں بھی اشتراکیت پسند اہل قلم کے لیے یہ بہترین موقع ہے کہ ترقی پسند تحریک میں بھی ''گلاس نوس'' کی پیروی کریں اور اس آفاقی تحریک کو زندہ جاوید بنادیں۔ اگر ایسا نہ ہوسکا تو نہ صرف ادب بلکہ بنی نوع انسان کی بھی بدقسمتی ہوگی۔

بقیہ: چھپتے چھپتے صفحہ : 7

اور اس جبر وجور پر کیسے سوال کرتا ہے، ایسے سوال ازل سے اب تک ہوئے ہیں اور ہوتے رہیں گے سو اس نے بھی کیے..... مگر اپنی زبان میں.... اپنے طنطنے کے ساتھ:

تو خدا ہے تو ہمیں بھی ہے اَنا کا پندار — حق سمجھتے ہیں جو ہم تجھ سے دعا مانگتے ہیں

جسم پہ لگ رہے ہیں زخم نیزۂ اعتبار کے — اے مرے ہوش کچھ تو کہہ، اے مرے خواب کچھ تو بول

نہ جانے کب سے ہم پہ قرض ہے جنوں کی داستاں — سلیقۂ بیاں دیا تو اب ہمیں زباں بھی دے

لگاؤ دوستو دلوں میں ایسے آگہی کی آگ — جو گرم جسم کو رکھے کبھی کبھی دھواں بھی دے

کاش جب یہ پوری کتاب آئے تو میں اس پر کچھ لکھ سکوں۔ ایسے کاٹ دار لہجے کا شاعر جب پورے قدوقامت کے ساتھ سامنے آکر آواز لگاتا ہے تو..... تو بڑے بڑے پہاڑ ہل جاتے ہیں۔ فی الحال تو میں ممنون ہوں عاشور کاظمی کا کہ باقر نقوی سے اتنا ہی تعارف کرادیا۔ انسٹی ٹیوٹ آف تھرڈ ورلڈ آرٹ اینڈ لٹریچر، لندن سے تین اہم اردو کتابیں شائع کر چکا ہے، پہلے انگلستان سے اردو تخلیقات کی اشاعت باقاعدگی اختیار نہیں کر پائی تھی، اب آثار نظر آتے ہیں کہ یہ سلسلہ آگے ہی بڑھتا رہے گا، ''تازہ ہوا'' اس سلسلے کی ایک مضبوط کڑی لگتی ہے۔

باقر نقوی۔لندن

غزلیں (''تازہ ہوا'' سے)

قدم قدم روش روش گلاب جاگنے لگے
یہ کیسے دفعتاً ہمارے خواب جاگنے لگے
یہ کون اپنے خشک لب کے پھول لے کے آ گیا
سحاب جھومنے لگے، سراب جاگنے لگے
اُتر رہے ہیں ماہتاب کوزۂ نگاہ میں
رگوں میں آرزو کے آفتاب جاگنے لگے
بس اک ترے طلسمِ لب کے ٹوٹنے کی دیر ہے
حروف بولنے لگیں، کتاب جاگنے لگے
وہ معجزہ ترے بدن کے قرب کی کشش میں ہے
شباب گنگنا اُٹھے، شراب جاگنے لگے

بجلی جو بدن میں ہے چمک جائے گی اک دن
یہ درد کی بستی بھی مہک جائے گی اک دن
چمکے گا مری بھیگی ہوئی آنکھ کا سورج
پیغام مرا لے کے دھنک جائے گی اک دن
وہ ہوشر! چاند ہے بادل میں چھپا ہے
یہ وہم کی چادر ہے ڈھلک جائے گی اک دن
بوئے ہیں بہت خواب کسانوں نے سحر کے
اُمید کی یہ فصل بھی پک جائے گی اک دن
برسیں گی کسی روز تو یہ بانجھ گھٹائیں
ندی بھی سرابوں کی چھلک جائے گی اک دن
تھم جائیں گے لمحات ٹھہر جائیں گے موسم
رقاصۂ افلاک بھی تھک جائے گی اک دن

تمام زندگی اسی طرح بسر ہوئی تو کیا
غموں کی رات جھیل کر اگر سحر ہوئی تو کیا
بڑھی ہیں پھر اسی طرح دُکھوں کی خشک ندیاں
شکستہ بازوؤں کو دیر سے خبر ہوئی تو کیا
پڑیں گے جب کہ سارے مرحلے تو پھر یہ زندگی
طویل ہو گئی تو کیا، جو مختصر ہوئی تو کیا
کٹے ہیں ہاتھ، آنکھ پر بندھی ہوئی ہیں پٹیاں
نوشتۂ ازل کی پیش تر خبر ہوئی تو کیا
پکارتے ہیں آب آب ذرّہ ہائے دشتِ دل
قبائے غم ملی تو کیا، مژہ بھی تر ہوئی تو کیا
سلوکِ دوستاں سے سرد سارے حوصلے ہوئے
اگر ہمارے دشمنوں بھی خبر ہوئی تو کیا
خلائے جسم و روح جب کہ تشنۂ قدم رہیں
تمھی کہو کہ منزلِ قمر بھی سر ہوئی تو کیا
سنا ہے ٹڈیوں کا دَل بھی آ رہا ہے اس طرف
ہماری فصل اب کے سال خوب تر ہوئی تو کیا

کنبہ چھوڑا بستی چھوڑی جنگل ہو گئے ہم
جاناں! تیرے پیار میں کیسے پاگل ہو گئے ہم
ساری عمر سفر میں گزرے یہ بھی کوئی جینا
تیری نمو کی خاطر پھر بھی بادل ہو گئے ہم
جاتے وقت کے غم میں روتے رہ گئے سارے لوگ
بھاگتے لمحوں کے پیروں کی چھاگل ہوگئے ہم
کیسے کیسے جتن سے تیرا رُوپ سجایا ہے
مہندی ہو گئے، افشاں ہوگئے، کاجل ہوگئے ہم

کیسے کیسے بھیس میں لائی ہے عریانی مجھے
تشنگی کے نیش سے ڈستا رہا پانی مجھے
خوف سے طوفاں کے دھمکاتی رہی بادِ نسیم
بگڑے بگڑے نقش دکھلاتا رہا پانی مجھے
کتنے پُراسرار ہیں اس شہر کے شور و سکوت
کس جزیرے پر اُٹھا لائی ہے طغیانی مجھے
میں زمیں پر ڈھونڈتا ہی رہ گیا نقشِ ثبات
منھ چڑاتا ہے خلا سے اک تنِ فانی مجھے
سوچ سے معمور آنکھیں تہہ بہ تہہ ماتھے پہ بل
لگ گئی ہے ساری دنیا کی پریشانی مجھے

غزلیں (''مٹھی بھر تارے'' سے)

کب تلک ترسیں گی آنکھیں آسمانوں کے لیے
اب چھتیں بنواؤ شیشے کی، مکانوں کے لیے
ہم نے خود دیکھا کہ چڑیوں نے بھی تنکوں کے عوض
دھات کے ٹکڑے چنے ہیں آشیانوں کے لیے
پھولنے پھلنے کے قابل ہوں جو پانی کے بغیر
ایسے پودے ڈھونڈنے ہوں گے چٹانوں کے لیے
بن گئیں شوقِ سفر میں کتنی بھاری کشتیاں
زور طوفاں چاہیے ان بادبانوں کے لیے

آسماں کی وسعتیں غمگین ہیں اُن کے لیے
بیچ ڈالے پَر جنھوں نے چند دانوں کے لیے
گو زمیں کم پڑ گئی تھی پھر بھی اہلِ ذوق نے
ایک صحرا چھوڑ رکھا ہے دوانوں کے لیے
سر ہے پتھر کا، نہ اپنا جسم ہے بے استخواں
ہم تو کچھ موزوں نہیں ہیں آستانوں کے لیے
بس توانا ہاتھ یا اچھی کمانیں ہی نہیں
تیر بھاری چاہئیں اُونچے نشانوں کے لیے
آج کا گاہک اگر مجبور ہے اندھا نہیں
کتنا کھوٹا مال لاؤ گے دکانوں کے لیے
تذکرہ جن کا نئی نسلوں کو شرمندہ کرے
نام دے گا کون ایسی داستانوں کے لیے
ہم نے اک اخبار میں دیکھا انوکھا اشتہار
ہے ضرورت چند سانپوں کی خزانوں کے لیے

باقر نقوی۔لندن

غزلیں (''تازہ ہوا'' سے)

قدم قدم روش روش گلاب جاگنے لگے
یہ کیسے دفعتاً ہمارے خواب جاگنے لگے
یہ کون اپنے خشک لب کے پھول لے کے آ گیا
سحاب جھومنے لگے، سراب جاگنے لگے
اُتر رہے ہیں ماہتاب کوزۂ نگاہ میں
رگوں میں آرزو کے آفتاب جاگنے لگے
بس اک ترے طلسمِ لب کے ٹوٹنے کی دیر ہے
حروف بولنے لگیں، کتاب جاگنے لگے
وہ معجزہ ترے بدن کے قرب کی کشش میں ہے
شباب گنگنا اُٹھے، شراب جاگنے لگے

بجلی جو بدن میں ہے چمک جائے گی اک دن
یہ درد کی بستی بھی مہک جائے گی اک دن
چمکے گا مری بھیگی ہوئی آنکھ کا سورج
پیغام مرا لے کے دھنک جائے گی اک دن
وہ ہوشربا چاند ہے بادل میں چھپا ہے
یہ وہم کی چادر ہے ڈھلک جائے گی اک دن
بوئے ہیں بہت خواب کسانوں نے سحر کے
اُمید کی یہ فصل بھی پک جائے گی اک دن
برسیں گی کسی روز تو یہ بانجھ گھٹائیں
ندی بھی سرابوں کی چھلک جائے گی اک دن
تھم جائیں گے لمحات ٹھہر جائیں گے موسم
رقاصۂ افلاک بھی تھک جائے گی اک دن

تمام زندگی اسی طرح بسر ہوئی تو کیا
غموں کی رات جھیل کر اگر سحر ہوئی تو کیا
بڑھی ہیں پھر اسی طرح دُکھوں کی خشک ندیاں
شکستہ بازوؤں کو دیر سے خبر ہوئی تو کیا
پڑیں گے جب کہ سارے مرحلے تو پھر یہ زندگی
طویل ہوگئی تو کیا، جو مختصر ہوئی تو کیا
کٹے ہیں ہاتھ، آنکھ پر بندھی ہوئی ہیں پٹیاں
نوشتۂ ازل کی پیش تر خبر ہوئی تو کیا
پکارتے ہیں آب آب ذرہ ہائے دشتِ دل
قبائے غم ملی تو کیا، مژہ بھی تر ہوئی تو کیا
سلوکِ دوستاں سے سرد سارے حوصلے ہوئے
اگر ہمارے دشمنوں کو بھی خبر ہوئی تو کیا
خلائے جسم و روح جب کہ تشنۂ قدم رہیں
تمھی کہو کہ منزلِ قمر بھی سر ہوئی تو کیا
سنا ہے ٹڈیوں کا دَل بھی آ رہا ہے اس طرف
ہماری فصل اب کے سال خوب تر ہوئی تو کیا

کنبہ چھوڑا بستی چھوڑی جنگل ہو گئے ہم
جاناں! تیرے پیار میں کیسے پاگل ہو گئے ہم
ساری عمر سفر میں گزرے یہ بھی کوئی جینا
تیری نمو کی خاطر پھر بھی بادل ہو گئے ہم
جاتے وقت کے غم میں روتے رہ گئے سارے لوگ
بھاگتے لمحوں کے پیروں کی چھاگل ہوگئے ہم
کیسے کیسے جتن سے تیرا رُوپ سجایا ہے
مہندی ہو گئے، افشاں ہوگئے، کاجل ہوگئے ہم

کیسے کیسے بھیس میں لائی ہے عریانی مجھے
تشنگی کے نیش سے ڈستا رہا پانی مجھے
خوف سے طوفاں کے دھمکاتی رہی بادِ نسیم
بگڑے بگڑے نقش دکھلاتا رہا پانی مجھے
کتنے پُراسرار ہیں اس شہر کے شور و سکوت
کس جزیرے پر اُٹھا لائی ہے طغیانی مجھے
میں زمیں پر ڈھونڈتا ہی رہ گیا نقشِ ثبات
منہ چڑاتا ہے خلا سے اک تنِ فانی مجھے
سوچ سے معمور آنکھیں تہہ بہ تہہ ماتھے پہ بل
لگ گئی ہے ساری دنیا کی پریشانی مجھے

غزلیں (''مٹھی بھر تارے'' سے)

کب تلک ترسیں گی آنکھیں آسمانوں کے لیے
اب چھتیں بنواؤ شیشے کی، مکانوں کے لیے
ہم نے خود دیکھا کہ چڑیوں نے بھی تنکوں کے عوض
دھات کے ٹکڑے چنے ہیں آشیانوں کے لیے
پھولنے پھلنے کے قابل ہوں جو پانی کے بغیر
ایسے پودے ڈھونڈنے ہوں گے چٹانوں کے لیے
بن گئیں شوقِ سفر میں کتنی بھاری کشتیاں
زور طوفاں چاہیے ان بادبانوں کے لیے

آسماں کی وسعتیں غمگین ہیں اُن کے لیے
بیچ ڈالے پَر جنھوں نے چند دانوں کے لیے
گو زمیں کم پڑ گئی تھی پھر بھی اہلِ ذوق نے
ایک صحرا چھوڑ رکھا ہے دوانوں کے لیے
سر ہے پتھر کا ، نہ اپنا جسم ہے بے استخواں
ہم تو کچھ موزوں نہیں ہیں آستانوں کے لیے
بس توانا ہاتھ یا اچھی کمانیں ہی نہیں
تیر بھاری چاہئیں اُونچے نشانوں کے لیے
آج کا گاہک اگر مجبور ہے اندھا نہیں
کتنا کھوٹا مال لاؤ گے دکانوں کے لیے
تذکرہ جن کا نئی نسلوں کو شرمندہ کرے
نام دے گا کون ایسی داستانوں کے لیے
ہم نے اک اخبار میں دیکھا انوکھا اشتہار
ہے ضرورت چند سانپوں کی خزانوں کے لیے